# جہانِ عذاب

احمد اقبال

مکمل ناول



**کرم داد** عرف کرمو ولد حکم داد کمہار نسبتاً بلند مقام سے نیچے کا سارا منظر اسی طرح بالکل صاف دیکھ سکتا تھا جیسے اس نے ایک بار شہر کے سینما کی گیلری میں بیٹھ کے فلم مولا جٹ ساتویں بار دیکھی تھی۔

آج وہ بہت محتاط تھا۔ اسے پکڑے جانے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ پہاڑ کی نصف بلندی پر یہ ہموار چٹان کسی مچان کی طرح تھی۔ اس کے چاروں طرف خودرو جھاڑیاں تھیں اور درخت تھے۔ سامنے کا حصہ اب پورا کھلا ہوا تھا۔ نظر کی راہ میں حائل ہونے والی ایک جھاڑی کو اس نے کلہاڑی سے صاف کردیا تھا۔ اب وہ بڑے اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اسے وقت کے گزرنے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کی ساری دلچسپی تقریباً تیس فٹ نیچے کے منظر میں تھی۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ آج پھر اس کی وجہ سے کوئی گڑبڑ ہو پہلے ورنہ یہ بات یقینی تھی کہ آج اس کو سب سے پہلے وہ سب مل کے پھینٹی لگائیں گے جو نیچے جمع تھے۔ ان میں سے دو چار انسان سے زیادہ ریچھ اور بن مانس کی اولاد لگتے تھے۔ وہ کرمو کی ہڈیاں توڑ سکتے تھے۔

یہ بھی عین ممکن تھا کہ اسے حوالۂ پولیس کردیا جاتا اور پولیس اسے شہر کے تھانے لے جاکے اس کی ویسی ہی چھترول کرتی جیسی ایک بار کرمو کے اباجی کی ہوچکی تھی حالانکہ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اس نے سرعام بکری سے اظہار عشق کرنے والے بکرے کو جوتی کھینچ کے ماری تھی مگر نشانہ خطا ہوگیا اور جوتی اس کی بدقسمتی سے قانون کے ایک رکھوالے کو لگی جو عین اسی وقت سائیکل پر پیڈل مارتا ہوا صحن کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا تھا۔ ساری بات وقت کی تھی۔ اگر جوتی راکٹ کی رفتار سے نہ جاتی یا پولیس مین کی پرانی سائیکل کی رفتار کچھ زیادہ ہوتی تو ایسا افسوسناک اتفاق کیوں ہوتا۔ ابا اس کے بعد ایک ہفتے تک تشریف رکھتے وقت بہ آواز بلند کہتا تھا "ہائے او میرا ربا۔"

پولیس کی نفری شہر سے خصوصی حفاظتی انتظامات کے لیے لائی گئی تھی اور ان کا کام تھا دخل در معقولات کرنے والوں کو دور رکھنا مگر وہ خود دخل در معقولات کے بہت شوقین تھے۔ وہ بار بار بھیڑ میں گم ہوجاتے تھے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ بھی سینے میں دل اور دل میں جذبات رکھتے ہیں۔

پولیس کی نفری کل دو افراد پر مشتمل تھی۔ افسر اعلیٰ ایک حوالدار تھا جس کی داڑھی سیاہ اور مونچھیں سفید تھیں۔ بال مہندی سے بھورے تھے اور وہ ہر وقت نیلے رنگ کے شیشوں والا دھوپ کا چشمہ لگائے رہتا تھا۔ اس کے پاس سرکاری ریوالور بھی تھا۔ خلق خدا میں قانون کا خوف پیدا کرنے کے لیے وہ اکثر اس کی نمائش کرتا رہتا تھا۔ ایک بار کسی نے مذاق میں اس سے پوچھ لیا تھا کہ سرجی 'اس توپ میں سے کبھی آپ نے گولا چلایا ہے خود' تو اس نے سخت برا مان کے ریوالور کا رخ آسمان کی طرف کرتے ہوئے فائر کردیا تھا مگر ٹریگر کی ہلکی سی کلک کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ دھماکا اس وقت ہوا تھا جب وہ لوگوں کے ہنسنے پر شرم سے پانی پانی ہوکے ریوالور کو جیب میں رکھ رہا تھا۔

اس کا ماتحت ایک دبلا پتلا لچکدار بانس جیسا کانسٹیبل تھا جسے غلطی سے کسی موٹے تازے سپاہی کی وردی جاری کردی گئی تھی۔ یہ وردی اس کے ڈھانچا بدن پر ہینگر سے لٹکی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ممکن ہے پہلے کبھی وہ اتنا صحت مند ہو کہ وردی اس کے جسم پر فٹ آتی ہو اور بعد میں کسی دکھ یا بیماری نے اس کی یہ حالت کردی ہو۔ گاؤں کے مولوی صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اچھے خاصے ڈھائی من وزن اور ڈھائی فٹ [illegible] پہلے ہوئے ڈھول جیسے پیٹ کے مالک تھے پھر ان کا وزن تیزی سے کم ہونے لگا اور توند ہوا نکلے غبارے جیسی ہوگئی۔ حلوے سے بھی ان کو رغبت نہ رہی جو وہ اتنے خشوع و خضوع اور [illegible] کے ساتھ کھاتے تھے کہ ہر بار لگتا تھا آخری بار کھارہے ہیں۔ ان کی خوراک اتنی کم ہوگئی کہ بقول حکیم صاحب [illegible] تھے "وہ اپنی خوراک کی زکوٰۃ کھارہے ہیں۔" آزادی [illegible] کا استعمال کرتے ہوئے میراثی بیکے نے ایک محفل میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مولوی صاحب پر ایک جن کی نئی عاشق [illegible] ہے اور ان کو گنڈیری کی طرح چوس رہی ہے۔ حکیم صاحب [illegible] مطب کی ہر دوا آزمانے کے بعد بالآخر اعلان کیا [illegible] وجع المفاصل اور عارضۂ قلب [illegible] حکیم لقمان کے بعد صرف ان کے پاس [illegible] کہ ان کو شوگر کی بیماری ہوگئی تھی۔

کرمو اپنی "چاچے دی اکھ" [illegible] نظر آنے والے چالاک بھانجے کو بھگا آیا تھا۔ [illegible] میں منیجر اور سیلزمین کے فرائض سرانجام دینے میں ماہر ہوتا تھا۔ دو سال پہلے وہ ایک دو ٹافیوں یا میٹھی چھالیہ کے ایک پیکٹ کے معاوضے پر کرمو کی پراسرار اور خطرناک غیرحاضری میں کاروبار سنبھالنے پر راضی ہوجاتا تھا۔ بے شک ناواقفیت کے باعث اس نے کئی بار املی کے بھاؤ پر حقے کا تمباکو اور ناریل کے تیل کی جگہ مٹی کا تیل دیا۔ اور اس کا خمیازہ کرمو نے بھگتا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ وہ کرمو سے پانچ روپے گھنٹا وصول کرنے کے علاوہ ٹھگی کے فن میں بھی طاق ہوچکا تھا۔ دو سال پہلے کرمو کا عاشقی سے بھرپور دھواں دھار قسم کا فلمی عشق چل رہا تھا۔ اس کے لیے انتہائی رومانی ماحول خود قدرت نے فراہم کر رکھا تھا۔ وہ سید پور کی پہاڑیوں کے غاروں اور سرسبز درختوں کی پناہوں میں ہر وقت مل سکتے تھے .... جون کی چلچلاتی دوپہر میں جب ہر طرف الّو بولتے تھے یا دسمبر کی راتوں میں جب گیدڑ سردی سے چلاتے پھرتے تھے۔ بالآخر ان کے چاچاؤں ماموؤں نے جو سب داڑھیوں والے تھے انہیں جھاڑیوں میں خرگوش کی طرح دبکے ہوئے گرفتار کیا اور چونکہ وہ ان ہی کی اولاد

تھے اس لیے فیملی کورٹ نے ان کو قیدِ شریعت کی سزا دینے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کا کرمو کو ہمیشہ قلق رہا۔ ایک سنسنی خیز عشق کا ایسا دردناک انجام!

عائشہ سے عشق کے زمانے میں کرمو کے بھانجے نے "چاچے دی ہٹی" سنبھال کے اپنے ماموں کی بہت مدد کی تھی اور افشائے راز کے بعد سب سے زیادہ جوتے بھی کھائے تھے مگر سب سے بڑا نقصان یہ ہوا تھا کہ وہ بے روزگار ہوگیا تھا اور اس کی آمدنی کے جائز و ناجائز ذرائع ماما جی کی شادی کے ساتھ ہی ختم ہوگئے تھے۔

گزشتہ مہینے کرمو کو پھر بھانجے کی یاد آئی "اوئے گامی، ادھر ادھر ویلا پھرتا ہے، دکان پر آجا۔"

گامی نے تاڑلیا کہ ماما جی کی بات بے مقصد نہیں "میں تو سوچ رہا تھا کہ کل سے مولوی صاحب کے پاس جاؤں سپارہ پڑھنے۔"

کرمو نے اس کی گدی پر ہاتھ مارا "مجھے چلاتا ہے۔ تیرے باپ نے بھی پڑھا تھا سپارہ۔ کل بارہ بجے آجانا۔"

اس نے بسورتے ہوئے سوال کیا "کس سے ملنے جانا ہے آخر؟ تمہاری تو شادی ہوگئی ہے۔ اب کس کے ساتھ چکر ہے؟"

کرمو نے اس کے دوسرا ہاتھ رسید کرنے کی ناکام کوشش کی "تو اپنے مامے کو ایسا سمجھتا ہے گامی۔ شادی کے بعد چکر چلاؤں گا میں۔"

گامی غوطہ مار کے سیدھا ہوگیا "چاچے نے بھی تو چلا رکھا ہے۔"

کرمو بھونچکا رہ گیا "کون سے چاچے نے۔ کس کے ساتھ چکر چلا رکھا ہے؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا" گامی نے کہا۔

"گامی حرامی.... تیرا ماما ہوں میں۔" کرمو نے دوستانہ لہجہ اختیار کرلیا "تو یار ہے میرا۔"

"تمہاری بات بھی میں نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔" گامی نے رازداری کے اصولی موقف پر سمجھوتا کرنے سے انکار کردیا لیکن کرمو سمجھتا تھا کہ اسے بتانی نہ ہوتی تو وہ ایسی بات ہی کیوں کرتا۔

دس روپے جیب میں ڈال کے اس نے کرمو کو ایک نام بتادیا۔

کرمو کے دل کو دوسرا صدمہ پہنچا۔ یہ نام گاؤں کی سب سے حسین بیوہ کا تھا جس کا دکھ بٹانے اور تنہائی دور کرنے کے غم میں دبلے ہونے والوں کی قطار بڑی لمبی تھی۔ اس قطار میں کرمو کے ابا، اسکول کے ماسٹر صاحب اور ریٹائرڈ یک چشم صوبے دار نیک محمد، شاہی حکیم اور نیکے میراثی تک سب ہی شامل تھے۔ خود کرمو کو یقین تھا کہ وہ اس کی طرف مسکرا کے میٹھی میٹھی نظروں سے بلاوجہ نہیں دیکھتی۔ گامی کی اطلاع نے اسے مایوس کیا تھا۔

"چاچا تو مارا جائے گا۔ بڑی حرامن ہے وہ۔" کرمو نے کہا "تو بارہ بجے آئے گا یا میں کسی اور سے بات کروں۔"

"تیرا ابا مارے گا۔"

"اوئے پاگل دے پتر۔ وہ اب ادھر کیسے آسکتا ہے۔ اسے نظر ہی کچھ نہیں آتا" کرمو نے کہا۔

گامی نے سوچ کے کہا "کتنی دیر کے لیے جانا ہے۔"

"دو تین گھنٹے۔"

گامی نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا "ادھر ہی جاؤ گے ماما جی!"

"ہاں" کرمو نے کہا "پانچ روپے روز دوں گا لیکن کوئی چیز ادھر ادھر ہوئی تو خیر نہیں تیری۔ ایک ایک چیز میری گنی ہوئی ہے۔"

"پھر میں دس روپے لوں گا۔" گامی نے واضح کردیا کہ بصورت دیگر پانچ روپے ہیرا پھیری سے پیدا کرنا اس کا حق ہے۔

کرمو نے بادل ناخواستہ یہ شرط قبول کی۔ وہ جانتا تھا کہ دس روپے لے کر بھی وہ ڈنڈی ضرور مارے گا۔ آخر وہ اسی کا بھانجا تھا۔

"تم ادھر کیسے جاؤ گے ماما جی؟ پولیس پکڑلے گی" گامی نے کہا۔

"تو اس کی فکر مت کر۔ اگر کسی کو بتایا تونے یا ہیرا پھیری کی تو پتر سارے کپڑے اتار کے چھوڑ آؤں گا آمنہ کے سامنے۔"

بارہ سالہ گامی کا چہرہ شرم سے لال ہوگیا۔ آمنہ اس کی آٹھ سالہ منگیتر تھی۔ ان کی منگنی کو بھی آٹھ سال ہوگئے تھے۔

کرمو کو خفیہ راستے معلوم تھے۔ اس کی زندگی کے بائیس سال ان ہی پہاڑوں میں بھٹکتے گزرے تھے۔ اس نے صحیح جگہ کا انتخاب کیا اور تمام حفاظتی انتظامات سے بے نیاز وہاں پہنچ گیا جہاں سے وہ سب کچھ صاف دیکھ اور سن سکتا تھا۔ یہاں بہت بلندی سے آنے والا پانی کا دھارا ایک تالاب میں جمع ہوتا تھا۔ یہ جگہ اس کے دائیں ہاتھ پر تھی پھر تالاب کا پانی ایک چٹان کے اوپر سے بہہ کر آٹھ دس فٹ نیچے نسبتاً ہموار جگہ پر شفاف پانی کی جھیل بناتا تھا۔ جھیل تقریباً دس فٹ چوڑی تھی۔ اس کے بعد یہ پانی پھر پتھریلے راستے پر بہتا ہوا نیچے سید پور گاؤں کی طرف چلا جاتا تھا۔

پکنک یا فلموں کی شوٹنگ کے لیے آنے والے سب لوگ جھیل کے آس پاس کی جگہ کا انتخاب کرتے تھے۔ یہاں وہ چکنے پتھروں پر پانی میں پاؤں لٹکا کے بیٹھتے تھے یا آٹھ دس فٹ کی بلندی سے گرنے والے آبشار کے نیچے کھڑے ہو کے نہاتے تھے۔ اس قدرتی چشمے کا پانی شہر کے نلکوں سے بہنے والے پانی کے برعکس شفاف، ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

راولپنڈی شہر سے یہ جگہ نو دس میل دور تھی۔ سید پور کے پہاڑوں کا یہ سلسلہ نور پور شاہاں سے آگے تک پھیلا ہوا تھا۔ نور پور شاہاں میں حضرت بری امام کا مزار تھا جہاں ہر سال بڑا میلہ لگتا تھا۔ عرس کے موقع پر عقیدت مندوں کے غول ہر شہر سے چادریں چڑھانے آتے تھے۔ ڈھول بجاتے، مستی میں رقص کرتے اور نعرے لگاتے۔ کرمو نے ایسا دیکھا نہیں تھا مگر سنا تھا کہ تقسیم ہند

سے پہلے یہاں ہندوستان کے ہر شہر کی طوائفیں پہنچتی تھیں اور عرس کے موقع پر خوب جوا ہوتا تھا۔ لاکھوں لٹا کے یا ہار کے واپس جانے والے کسی سے بس کا یا ریل کا کرایہ مانگتے نظر آتے تھے۔ محکمہ اوقاف نے مزار کو اپنی تحویل میں لیا تو مجرا اور جوا سب بند ہوگیا۔ کہتے ہیں ایک بار عرس کے موقعے پر ضلع ہزارہ کے ایک انتہائی معزز اور اہم ترین سیاسی حیثیت رکھنے والے خاندان کی دو عورتوں کا قتل ہوگیا۔ اس کے بعد سارے بدمعاش قسم کے ملنگ اور مجاور پکڑ لیے گئے اور مزار کے تقدس اور احترام کو بحال کردیا گیا۔ اب وہاں صرف عرس ہوتا تھا۔

سید پور کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں ہندو بھی آباد تھے۔ راولپنڈی شہر کی آخری حد ایک زمانے میں وہ جگہ تھی جو "بنّی" یا بنّی مائی ویرو کہلاتی ہے۔ سید پوری روڈ چوک بنّی مائی ویرو سے شروع ہوتی تھی۔ بعد میں شہر اور آگے مسلم ہائی اسکول اور گورنمنٹ کالج تک پھیل گیا۔ چوک اصغر مال کے آگے ہولی فیملی اسپتال کی عمارت شہر کے مضافات میں بالکل الگ اور بہت دور سمجھی جاتی تھی۔

سید پوری روڈ آبادی سے نکلتی تھی تو خوبانی کے باغات شروع ہو جاتے تھے۔ پتلی سی سڑک پر خوبانی کے درختوں کی شاخیں یوں سایہ فگن رہتی تھیں اور سائیکلوں پر پکنک منانے کے لیے آنے والے نوجوان تازہ میٹھے مہکتے رس سے بھری خوبانیاں توڑ توڑ کے کھاتے جاتے تھے۔ انہیں یہ خوف بالکل نہیں ہوتا تھا کہ باغ کے مالی نے یا مالک نے دیکھ لیا تو انہیں چور کہے گا اور گالیاں دے گا یا بے عزت کرے گا۔ تب سینوں میں دل فراخ تھے۔

جہاں سید پوری روڈ ختم ہوتی تھی وہاں سید پور تھا۔ ایک گاؤں جو پہاڑ کے دامن میں قدرے ترتیب سے اور اوپر قدرتی بے ترتیبی کے ساتھ آباد تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے والے ایک کچے راستے پر چلتے جاتے تھے۔ اس پر پہاڑ بائیں جانب تھے۔ دائیں جانب گاؤں کے تقریباً درمیان میں دو اشنان گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ اوپر پہاڑوں سے آنے والے چشمے کا پانی پہلے ایک چار دیواری سے گھرے ہوئے احاطے سے گزرتا تھا۔ یہ عورتوں کے نہانے اور کپڑے دھونے کی جگہ تھی۔ وہ پختہ تالاب سے پانی لیتی جاتی تھیں اور بلندی کی جانب سے قدرتی واٹر سپلائی جاری رہتی تھی۔ چنانچہ تالاب کبھی خالی نہیں ہوتا تھا۔

یہ تالاب بھر جاتا تو چھلک جانے والا پانی آگے سفر کرتا تھا اور درمیانی دیوار کے دوسری طرف مردوں کے لیے مخصوص نہانے دھونے کے احاطے میں پہنچ کر دوسرے تالاب کو بھرنے لگتا تھا۔ پہاڑی چشمے سے اتنا ہی پانی آتا تھا جتنا شہر میں ایک ڈیڑھ انچ کے پائپ سے آتا ہے مگر یہ سپلائی دن رات کے چوبیس گھنٹے' سال کے بارہ مہینے مسلسل جاری رہتی تھی چنانچہ سب کو قدرتی تازہ پانی ہر وقت دستیاب رہتا تھا۔

کچے راستے پر چلنے والے ایک چھوٹے سے خستہ حال اور ویران مندر کے پاس سے گزرتے تھے اور پھر بائیں ہاتھ پر پہاڑ کی چڑھائی کا سفر کرتے تھے۔ پر پیچ راستہ آہستہ آہستہ بلندی کی طرف چلتا جاتا تھا یہاں تک کہ تالاب' آبشار اور جھیل کا منظر ان کے سامنے آجاتا تھا اور وہ وہیں پڑاؤ ڈال دیتے تھے۔ پہاڑ کی انتہائی بلندی تک پہنچ کے دوسری طرف کا منظر دیکھنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا تھا۔

پکنک منانے والے یہاں ہر چھٹی والے دن ہر طرف منڈلاتے نظر آتے تھے۔ فلموں کی شوٹنگ کرنے والے یہاں صرف دو بار آئے تھے۔ ایک بار اس وقت جب کرمو کو فلموں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اور یہ بھی پتا نہیں تھا کہ لڑکیوں سے عشق کیوں ہوجاتا ہے۔ دوسرا فلم یونٹ آیا تو پانچ سال گزر چکے تھے اور کرمو شہر جا کے کئی فلمیں دیکھ چکا تھا اور اس کی معلومات پنجابی فلموں کی حد تک بہت وسیع تھیں۔ وہ نغمہ' فردوس اور انجمن کی رنگین تصویریں مختلف رسالوں کے سرورق سے اتار کے لاتا تھا اور انہیں چھپ چھپ کر دیکھتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ ایسی ہی کسی مُیار کے ساتھ اسے بھی عشق ہوجائے مگر سید پور میں نہایت فضول قسم کی لڑکیاں نظر آتی تھیں جن میں سے بیشتر اس کی کزن تھیں' چاچے' مامے' خالہ' پھوپی وغیرہ کی اولادیں لیکن کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ان ہی میں سے ایک نے کچھ رنگ روپ نکالا تو کسی حد تک زمرد کی طرح نظر آنے لگی اور کرم داد نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے اسی سے دل لگانے کا فیصلہ کیا۔

کرمو کی داستانِ عشق کی ہیروئن عائشہ عرف آشی اب اس کے ایک بچے کی ماں تھی اور محبوبہ سے بیوی بنتے ہی گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہوگئی تھی جسے وہ بہرحال بجانے پر مجبور تھا۔

تیسرا فلم یونٹ اب آیا تھا۔ تقریباً تین سال کے بعد اور یہ ایک اتفاق تھا کہ سب سے پہلے نیکے میراثی نے اسے یہ خبر سنائی۔ نیکا میراثی شہر کے ایک سرکس کے دروازے پر شام چھ بجے سے رات نو بجے تک ڈھول بجاتا تھا اور ایک بار کرم داد کو بھی مفت سرکس دکھا چکا تھا۔ اس نے کرمو کو اپنا بھائی ظاہر کیا تھا اور ایک خفیہ راستے سے اندر پہنچا دیا تھا۔ کسی میراثی کا بھائی کہلانا کرمو کے لیے بڑی بے عزتی کی بات تھی مگر شوق کی خاطر اس نے یہ رسوائی بھی برداشت کی اور بہت بڑے خیمے کے پچھلے حصے کی قنات اٹھا کے کیچوے کی طرح زمین پر رینگتا پنڈال میں داخل ہوگیا۔

کرمو سرکس کے سارے تماشے سانس روکے اور آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ اس کے نزدیک وہاں جو کچھ ہو رہا تھا ناممکن تھا۔ اس نے بہت بلندی پر جھولوں کے کرتب دکھانے والی لڑکیوں کو دیکھا جو ایک جھولے کو انتہائی اونچائی پر چھوڑ دیتی تھیں مگر نیچے گرنے سے پہلے مخالف سمت سے آنے والے جھولے کو پکڑ لیتی تھیں یا کسی کے پیروں سے لٹک کے دوسری طرف پہنچ جاتی تھیں۔

ہر بار جب ایک لڑکی ادھر سے ادھر ہوتی تھی تو کرمو کا سانس ہی نہیں دل بھی رک جاتا تھا اور وہ آنکھیں بند کرلیتا تھا۔ ایک لڑکی نے اُس جوکر کے کندھے پر بیٹھ کے کرتب دکھاتی رہی جو صرف ایک پہیے والی سائیکل چلا رہا تھا پھر دوسری لڑکی نے شیر پر سواری کی اور جب تیسری لڑکی کو ہاتھی نے کمر کے گرد سونڈ ڈال کے اٹھایا تو کرمو کا پیشاب خطا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ سرکس کا آخری شو تھا اور فیکے میراثی نے اپنا وعدہ نبھانے کے لیے ہر طرف سے مایوس ہو کے بالآخر اپنے یار کو اندر پہنچانے کا ایک طریقہ نکال لیا تھا۔

شو کے بعد کرمو نے فیکے میراثی کو جپھی ڈال کے اپنے احسان مندی کے جذبات کا اظہار کیا اور فیکے میراثی کے سوال پر کہا "یار شو تو ایسا تھا کہ مجھے لگتا تھا میں خواب دیکھ رہا ہوں مگر یہ لڑکیاں بڑی بے شرم ہیں۔ صرف چڈی پہنتی ہیں اور اوپر تو بس توبہ توبہ....بالکل ننگی نظر آتی ہیں یار سب کے بیچ میں" اور اس تبصرے پر فیکا مراثی ہنستے ہنستے بے حال ہوگیا تھا۔

کسی شوبزنس کے رپورٹر سے زیادہ باخبر فیکے میراثی نے بڑی رازداری سے کرمو کو بتایا تھا کہ فلمی یونٹ کل صبح پہنچ رہا ہے "چھ دن شوٹنگ چلے گی اور پتا ہے شوٹنگ میں کون آئے گا؟"

فرطِ اشتیاق سے کرمو کا حال خراب ہوگیا "اب بتادے میراثی کی اولاد!"

"انجمن اور سلطان راہی" فیکے میراثی نے دھماکا کیا۔

دھماکے سے کرمو سن ہوگیا "انجمن....اور سلطان راہی۔ یہاں سید پور میں.... نہیں یار' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"دیکھ لینا کل۔ اپنی بات ایسے ہی نہیں ہوتی۔"

"یار' انجمن رہے گی کہاں گاؤں میں؟"

فیکے میراثی نے ہنس کے کہا "اوئے پاگل دے پتر۔ وہ روز گاڑی میں بیٹھ کے پنڈی سے آئے گی۔ کام ختم اور واپس اپنے ہوٹل۔"

پہلے دن خاصی گڑبڑ ہوئی۔ انجمن کے دیدار کی حسرت میں دیوانے ہر طرف سے جمع ہو کے آگئے۔ پولیس نے انہیں دور رکھنے کے لیے ڈنڈے بھی مارے مگر وہ ذرا سی دیر کے لیے ادھر ادھر ہو کے پھر آجاتے تھے۔ کرمو نے اس محفوظ مقام سے جہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا' پولیس اور انجمن کے پرستاروں کی دوڑ بھاگ کا پرلطف نظارہ کیا۔ اسے ڈنڈے کھا کے بھاگنے والوں میں اپنے دو مامے بھی نظر آئے اور اس نے حکیم صاحب کو بھی ایک ڈنڈے پر بلبلا کے فرار ہوتے دیکھا۔ پولیس نے دور سے فحش اشارے کرنے والے نوجوانوں پر پتھر بھی پھینکے۔ اس سے ان کے جوش وجذبے میں اضافہ ہوا۔ سید پور کا نائی رمضان ہاتھ میں استرا لہرا کے حوالدار کو شیو بنوانے کی دعوت دینے لگا۔ باریش حوالدار کے لیے یہ شرعی گستاخی ناقابلِ برداشت ہوگئی اور اس نے غصے میں ریوالور نکال کے ایک ہوائی فائر کردیا۔ دھماکا پہاڑوں میں بڑے دہشت ناک طریقے پر گونجا۔ ایک ساتھ درختوں سے سیکڑوں پرندے شور مچاتے اڑے اور ان کے ساتھ ہی شرپسند بھاگے تو پھر پلٹ کے نہیں آئے۔ گھر پہنچنے کے بعد ان کی ماؤں نے انہیں اپنے ہاتھوں سے کوٹ کے کلیجے سے لگالیا ہوگا کہ حرامی شکر کر تجھے گولی نہیں لگی۔

شوٹنگ دوپہر کے بعد شروع ہوئی۔ لش پش کرتے ہیجان انگیز لباس میں لشکارے مارتی انجمن تالاب کی طرف بڑھی۔ ڈائریکٹر کے چلانے پر سب بالکل خاموش ہوگئے تھے سوائے کچھ پرندوں کے۔ انجمن کو تالاب میں اترنے سے پہلے پائینچے اوپر کرنے تھے اور پھر ادھر ادھر دیکھ کے نہانے کے لیے آبشار کے نیچے جاکر کھڑا ہونا تھا۔ یونٹ کے سارے ارکان سانس روکے کھڑے تھے اور اوپر بیٹھا ہوا کرمو بھی پلک جھپکائے بغیر انجمن کو دیکھ رہا تھا۔

اس اچانک خاموشی میں ایک آواز گونجی "اوئے حرام دے تخم ہٹی چھوڑ کے ادھر بیٹھا ہے" یہ آواز کرمو کے چاچا کی تھی۔

ڈائریکٹر نے چیخ کے کہا "کٹ۔ کٹ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کون الّو کا پٹھا ہے یہ۔"

کرمو کے چاچا نے اس کا کان پکڑلیا تھا اور اسے یوں کھینچ کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا جیسے خراب گاڑی کو دوسری گاڑی سے باندھ کر لے جاتے ہیں۔

کرمو نے شور مچایا "اوئے چاچا' میرا کان نکل جائے گا۔"

چاچا نے کہا "کان نہیں تیری جان نکل جائے پر میں نے چھوڑنا نہیں۔ ابھی جاکے بھائی جی کو بتاتا ہوں۔"

ڈائریکٹر نے چلا کے پولیس والوں کو متوجہ کیا "اوئے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو' شوٹ کردو انہیں۔ سارے سین کا بیڑا غرق کردیا۔ چلو دوسرا ٹیک۔"

پولیس کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی کرمو اپنے چاچا کے ساتھ احتجاج کرتا ہوا روانہ ہوگیا تھا۔ ساری خرابی گامی نے ادھار سے انکار کرکے پیدا کی تھی۔ اس نے کرمو کے چاچے کے اس دعوے کو بھی مسترد کردیا تھا کہ چاچے دی ہٹی اس کے بھائی کی ہے چنانچہ وہاں سے وہ کچھ بھی لے جانے کا حق رکھتا ہے۔ گامی نے یہ کہا تھا کہ جب کرمو خود ہٹی پر ہو تو آپ بے شک ساری دکان اٹھا کے لے جاؤ اور پھر یہ بتادیا تھا کہ کرمو سے این او سی لینے کے لیے چاچا کو کہاں جانا پڑے گا۔

دوسرے دن جو بھی ہوا اسے شومئی قسمت کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا اور بقول فیکے میراثی کے "جب جب جو جو ہونا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے" یہ عظیم فلسفیانہ سچائی کسی فلم سے ماخوذ تھی۔

طے شدہ شیڈول کے مطابق انجمن نے تالاب میں اتر کے ایک گانا شروع کیا اور کسی جل پری کی طرح تیرتے ہوئے اٹھلاتی رقص کرتی مچلتی آگے بڑھی۔ اس نے پانی کے دھارے کے نیچے پہنچ کر مزید قیامت خیز ادائیں دکھائیں اور اوپر سے کرمو نے بھیگی ہوئی

چونی کی حشر سامانی، پرندے کی آنکھ سے دیکھی یعنی اس کو (BIRD'S EYE VIEW) میں وہ بھی نظر آیا جو انجمن کے عین سامنے کھڑے ہوئے یونٹ کے دیگر ارکان بشمول کیمرا مین، ڈائریکٹر وغیرہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

اس نظارے نے کرمو کے ہوش اڑا دیے تھے۔ کہانی میں سین کچھ یوں تھا کہ ہیرو جو کہ ایک مشہور اور مطلوب ڈاکو ہے، اپنی محبوبہ انجمن سے ملنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کے پہنچتا ہے لیکن اسے محوِ غسل و رقص دیکھ کے بے خودی میں ایک درخت کے پیچھے سے نظارۂ حسن کرتا ہے۔ کسی مخبر کی اطلاع پر پولیس بھی اس کے تعاقب میں ہے۔ ڈاکو ہیرو کا ایک ساتھی بروقت پولیس پارٹی کو دیکھ لیتا ہے اور دوڑتا ہوا آکے اپنے سردار کو خبردار کرتا ہے۔ ڈاکو ہیرو کو افسوس ہوتا ہے کہ اس نے خوا مخواہ وقت ضائع کیا۔ اب یا تو وہ ہیروئن سے ملے بغیر فرار ہو جائے یا عشق کی آبرو نبھانے کے لیے سارے خطرات کو نظرانداز کرتے ہوئے تالاب میں کود پڑے۔ آبشار کے نیچے جاکے ہیروئن سے کہے کہ "آ سینے نال لگ جا ٹھا کرکے" یا پھر ٹھا کرکے آنے والی گولی کا نشانہ بن جائے۔ چونکہ وہ ہیرو تھا اس لیے فرار ہونا اس کی شان کے خلاف ہوتا۔

سین مکمل ہونے سے پہلے کئی بار گڑبڑ ہو چکی تھی اور ڈائریکٹر ایک ہی شاٹ کو باربار ری ٹیک کرنے سے سخت جھلایا ہوا تھا۔ سب سے پہلے کیمرے نے ہیرو کو دکھایا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور دبے پاؤں آگے بڑھا کیونکہ اس کے کانوں نے ہیروئن کے گانے کی آواز سن لی تھی اور اب وہ درخت کی اوٹ سے اس کو رقص و غسل کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ گھوڑے سے چھلانگ مار کے اترا تو اس کی خوفناک مونچھیں گر گئیں۔ ڈائریکٹر نے سر پر رکھا ہوا فیلٹ ہیٹ اتار کے زمین پر مارا اور چلا کے کہا "کٹ... کٹ..." یونٹ کے سب لوگ ہنس رہے تھے اس لیے کسی نے اوپر تشریف رکھنے والے کرمو کی ہنسی پر غور نہیں کیا۔

شاٹ پھر لیا گیا تو پولیس کے آنے کی اطلاع دینے والے ڈاکو کے بریک فیل ہو گئے۔ وہ گھبرایا ہوا دوڑ کے آیا اور تالاب میں گر گیا۔ گرنے سے پہلے اس نے ڈائیلاگ بول دیا تھا "سردار! پولیس آ گئی۔"

اس دن بس اتنی ہی شوٹنگ تھی اور اس میں بھی غیر ضروری تاخیر ہونے سے انجمن کا غسل بھی بہت لمبا ہو گیا تھا۔ گانا باربار بجایا جا رہا تھا اور انجمن کو سردی لگ رہی تھی مگر شاٹ مکمل کرنا ضروری تھا چنانچہ تیسرا ٹیک لیا گیا۔

اس میں کوئی گڑبڑ نہ ہوتی مگر وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اوپر کہیں پہاڑ پر چرنے والی کسی بکری کے پیر لڑکھڑائے۔ اس سے ایک پتھر لڑھکا جو آدھا پاؤ وزن کا بھی نہیں تھا مگر نیچے پہنچتے ہوئے اس کی رفتار خاصی خطرناک ہو گئی۔ پتھر پہلے کرمو کے قریب چٹان پر گرا اور پھر اچھل کے نیچے گیا اور ڈاکو ہیرو کے خاموشی سے سرنگوں کھڑے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر لگا۔ کرمو کو معلوم تھا کہ گھوڑا اس ریڑھے کا ہے جس میں گلاب دین ہر روز دودھ پہنچانے شہر جاتا ہے اور بہت مسکین طبع ہے مگر چوٹ کھا کے وہ بری طرح چلایا اور اچھل کے بھاگا۔ گانے کے بیچ میں گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سے شاید کوئی فرق نہ پڑتا مگر گھوڑا بدک کے دوڑا تو اس نے سین کا حشر نشر کر دیا۔ یونٹ کے ارکان ادھر ادھر بھاگے۔ ہیرو درخت سے چمٹ گیا۔ کیمرا مین نے چھلانگ مار کے ڈائریکٹر کے اوپر سے گزرنے کی کوشش کی تو کرسی نہ پھلانگ سکا۔ کرسی ڈائریکٹر اور کیمرا مین کے ساتھ اوندھی ہو گئی۔

جب بالآخر حالات قابو میں آئے تو چیخ چیخ کے ڈائریکٹر پاگل ہو گیا تھا۔ انجمن نے شاٹ ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اسی طرح آبشار کے نیچے مٹکتی گاتی رہی تو اسے ڈبل ٹرپل نمونیا ہو جائے گا۔ یونٹ کے جو ارکان دور تھے اور سین میں گھوڑے کی مداخلت سے ہراساں نہیں ہوئے تھے انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ پتھر اوپر سے پھینکا گیا تھا۔

کرمو کو اس وقت پتا چلا جب پولیس نے اسے دبوچ لیا اور مکّے ڈنڈے مارتے ہوئے نیچے لے جاکے ڈائریکٹر کے سامنے پیش کر دیا۔ ڈائریکٹر نے اسے پہچان لیا "تم.... تم نے ہی اس دن بھی گڑبڑ کی تھی۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم نے گھوڑے کو پتھر کیوں مارا؟ بولو" وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

پولیس نے اسے چار ڈنڈے اور مارے تو کرمو چلانے لگا "قسم خدا کی پتھر میں نے نہیں مارا۔ وہ تو اوپر سے آیا تھا۔ میں تو بالکل چپ چاپ بیٹھا شوٹنگ دیکھ رہا تھا۔ کل بھی موجود تھا میں، میں صرف انجمن کو دیکھنے آتا ہوں۔"

اس وقت نہ جانے کیسے خدا نے انجمن کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے پولیس کو روک دیا۔ وہ کپڑے بدل چکی تھی اور اپنے بال خشک کر رہی تھی۔ اس نے ہنس کے کہا "اچھا۔ تو تم مجھے دیکھنے آتے ہو۔ بدمعاش، اوپر بیٹھ کے نظارے بازی کرتے ہو۔ کل سے یہاں بیٹھ کے دیکھنا۔"

اس اجازت نامے نے کرمو کو اچانک مجرم سے مہمان کی حیثیت عطا کر دی۔ اب نہ پولیس اس کو روک سکتی تھی اور نہ ڈائریکٹر منع کر سکتا تھا۔

شام تک یہ خبر سید پور کے ہر فرد تک پہنچ گئی تھی کہ کرم داد کو فلموں کی ہیروئن انجمن نے اپنے خاص مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا ہے۔ کرمو کو پولیس کے ڈنڈے کھاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا چنانچہ اس واقعے کو کرمو نے یوں بیان کیا۔

"میں ادھر کھڑا تھا، ڈائریکٹر کی کرسی کے پاس۔ سامنے انجمن نہا رہی تھی آبشار کے نیچے۔"

"سب کے سامنے؟" ایک نوجوان کا منہ کھل گیا۔

کرمو نے سر ہلایا "اور کیا غسل خانے میں چھپ کے نہاتی۔"

"توبہ توبہ!" کرمو کے چاچا نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا "ایسی ہی بے حیا ہوتی ہیں یہ۔ خبردار جو پھر ادھر گیا تو۔ ہمارے گھر کی عورتیں تو غسل خانے میں بھی کپڑے اتارتے ہوئے شرماتی ہیں۔"

"اچھا!" کرمو ہنسنے لگا "مگر چاچا۔ کپڑوں کے ساتھ نہا رہی تھی وہ۔"

"پھر کیا ہوا؟" ایک بے چین سامع نے کہا "آگے بتا۔"

"بس یار۔ اوپر سے کسی نے گھوڑے کو پتھر مارا۔ میں نے تو دیکھ لیا تھا اس کو بھاگتے ہوئے مگر اب نام لینے سے کیا فائدہ۔ گھوڑا بھاگا سیدھا انجمن کی طرف۔ سب لوگ چلانے لگے پکڑو پکڑو۔ آگے بڑھنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ ڈائریکٹر صاحب کی تو پتلون گیلی ہوگئی تھی۔ میں نے خود دیکھا' کیمرے والا بھی بھاگ گیا تھا۔ جب انجمن نے چیخ ماری تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ پولیس تک دور ہٹ گئی تھی۔ ہیرو درخت پر چڑھا ہوا تھا۔"

"او یار' گھوڑا تھا.... شیر یا پاگل کتا تو نہیں تھا" کسی نے کہا۔

کرمو کے چاچا نے شہر والوں کی بزدلی کے بارے میں ناقابلِ اشاعت تبصرہ کیا۔

کرمو نے اپنی داستانِ شجاعت جاری رکھی۔ "بس پھر میں دوڑا اور میں نے گھوڑے کی راس پکڑلی۔ بڑی کوشش کی اس نے چھڑانے کی مگر میں نے قابو کرلیا۔ بعد میں سارے آگئے واہ وا کرتے۔ انجمن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا' اس گبرو جوان نے بچالیا آج مجھے۔ اس نے سب کو شرمندہ کیا اور مجھے کہا کہ اب تم روز آؤ گے' مجھے کسی اور پر بھروسا نہیں۔"

کرمو کی تقدیر پر رشک اور حسد کرنے والے سامعین نے کرید کرید کر اس سے انجمن کی ساخت' رنگ روپ' جسمانی اعضا کے تناسب وغیرہ کے بارے میں بہت سے سوالات کئے کیونکہ اسے انجمن کو ایک ہاتھ کی دوری سے دیکھنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

جیتی جاگتی انجمن کو اتنے قریب سے دیکھنے والے کرمو نے ایک منجھے ہوئے سیاست داں کی طرح پریس کانفرنس کے تمام شرکا کو مطمئن کیا۔ کرمو تو انجمن کا بلندی سے فضائی جائزہ بھی لے چکا تھا چنانچہ بعض سنسر کی زد میں آنے والے سوالات کا جواب دے کر اس نے بڑی سنسنی پھیلائی اور اس کا چاچا فوراً اس بے شرمی کی رپورٹ کرمو کے ابا کو دینے کے لیے روانہ ہوگیا۔

پہلے کرمو نے ابا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا مگر کرمو کامیابی' غرور اور خوشی کے نشے میں تھا۔ اس کے حواس پر انجمن سوار تھی اور وہ اس کے ایک سو ایک پوز ابھی تک چشمِ تصور سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے لوگ البم میں لگی ہوئی تصویروں کو صفحے پلٹ پلٹ کے دیکھتے ہیں۔ ابا کو اس کے بھائی نے دو دن قبل بھی رپورٹ دی تھی کہ کرمو دکان پر سے غائب تھا اور وہاں گامی حرامی بیٹھا تھا جس نے حقے کا تمبا کو ادھار دینے سے انکار کیا تھا۔ کرمو کے ابا کو اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ لڑکا ہاتھ سے نکل گیا۔

زیادہ دہائی کرم داد کی سابقہ محبوبہ آشی نے ڈالی جسے یہ اطلاع ملی تھی کہ اس کا شوہر چھپ چھپ کر انجمن کو نہاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اطلاع نامکمل تھی۔ کرمو نے پہلے بہانہ بنا کے اس کو خاموش کیا اور پھر اسے بتایا کہ وہ پورے کپڑوں میں سب کے سامنے نہا رہی تھی۔ اسے دیکھنے والے دس بندے اور بھی تھے اور یہ ایک فلم کا سین تھا۔

آشی کے جذبات بدل گئے۔ کرمو اچانک اس کی نظر میں ہیرو بن گیا۔ وہ اس کے گلے سے لٹک گئی "ہائے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا کرمو۔"

کرمو نے اسے سمجھایا "جھلی۔ ادھر ایک بندہ فالتو نہیں جاسکتا۔ پولیس پکڑ کے ڈک دیتی ہے۔"

"مگر تجھے تو خود انجمن نے بلایا ہے۔"

"مجھے بلایا ہے نا۔ تجھے ساتھ لانے کا نہیں کہا نا" کرمو جھلا کے بولا۔

"ہائے کرمو۔ کہہ دینا یہ میری گھر والی ہے... مجھے بھی بڑا شوق ہے انجمن کو اور سلطان راہی کو دیکھنے کا۔"

لیکن اس کی ساری منت سماجت رائیگاں گئی۔ کرمو نے اس پر اچھی طرح واضح کیا شوٹنگ دیکھنے کے لیے وہ اپنے باپ کو ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ گھر والی کس کھیت کی مولی ہے۔

اگلے دن کرمو وقت سے بہت پہلے پہنچ گیا تھا۔ اپنی فطری خباثت کے باعث پولیس نے اسے پھر روکنے اور پکڑ کے ڈنڈے مارنے کی کوشش کی تھی مگر کرمو نے جب سینہ تان کے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا کہ اسے انجمن نے مہمان کی حیثیت سے بلایا ہے تو وہ خاموش ہوگئے۔

کرمو کو بڑی مایوسی ہوئی جب انجمن نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا حالانکہ وہ بہت نمایاں جگہ پر سب سے الگ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنا عید والا جوڑا پہنا تھا۔ بالوں میں خوب تیل ڈال کے مانگ نکالی تھی اور آنکھوں میں کئی بار سرمے کی سلائی پھیری تھی۔ عائشہ اس سے روٹھی ہوئی تھی چنانچہ اسے مخاطب کئے بغیر بددعائیں اور کوسنے دیتی رہی تھی "دیکھنا کل تو پتھر کرا تھا' بے زبان جانور کے اوپر۔ آج چٹان گرے گی اس خصماں کھانی پر اور اس کے چاہنے والوں پر...." کرمو کے ابا نے بھی اسے وارننگ دی تھی کہ وہ سیدھا دکان پر بیٹھنے نہ گیا تو اسے عاق کردیا جائے گا مگر کرمو پر ایسی باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ جب وہ باہر نکل رہا تھا تو اس کے چاچے نے اسے بڑے غور سے دیکھا تھا "اوئے جا تو ایسی تیاری سے رہا ہے جیسے انجمن سے نکاح پڑھوانا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے مجھے پتا نہیں کل کتنے ڈنڈے مارے تھے پولیس نے۔ ٹیکے میراثی نے دیکھا تھا۔"

کرمو نے اپنی خودی کو بلند رکھا اور متانت سے کہا "ٹیکا میراثی بکواس کرتا ہے۔"

کرمو سیٹ پر پہنچا تو شوٹنگ کے انتظامات مکمل تھے مگر جس کردار پر سین فلم بند ہونا تھا وہ غائب تھا۔ فلم کا سارا یونٹ پہنچ گیا پھر ڈائریکٹر کے ساتھ انجمن بھی آگئی۔ ہیرو کا آج کوئی رول نہیں تھا۔ ولن اپنی گاڑی میں پہنچا تو تیاری شروع ہوگئی۔ سین بہت مختصر تھا۔ ڈاکو ہیرو تو اپنی محبوبہ سے ملاقات کے بعد ڈزاڈز گولیاں چلاتا ہوا اور دائیں بائیں بندے لٹاتا ہوا نکل گیا تھا جیسا کہ ہیرو کرتا ہے۔

آج کا سین یہ تھا کہ ڈاکو ہیرو کے (گانا مکمل کرنے کے بعد) رخصت ہوتے ہی اچانک ولن نمودار ہوجاتا ہے۔ بھیگے کپڑوں سے لشکارے مارتے بدن والی ہیروئن کو دیکھ کر ولن کی آنکھوں میں شیطانی ہوس جاگ اٹھتی ہے۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح سہمی سمٹی ہیروئن کی طرف بڑھتے ہوئے قہقہے لگاتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتے ہوئے کہتا ہے "اج تے میں تینوں اپنے نال لے کے ہی جاواں گا سوہنی۔" مگر اسی وقت اوپر سے ہیروئن کا غیرت مند بھائی چھلانگ لگا کے کہتا ہے کہ اس سے پہلے تجھے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا کمینے۔ اس کے جواب میں ولن دوسرا بھیانک قہقہہ لگا کے کہتا ہے کہ یہ کیا مشکل ہے میرے لیے۔ بھائی اپنی بہن سے کہتا ہے کہ تو بھاگ جا اور وہ فوراً ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی روانہ ہوجاتی ہے۔ ادھر ولن اپنی ڈب سے ریوالور نکالتا ہے اور راہ میں حائل ہوجانے والے غیرت مند بھائی کو گولی مار دیتا ہے پھر وہ اس کی لاش پر سے گزر کے ہیروئن کے تعاقب میں روانہ ہوجاتا ہے۔

سین بہت مختصر تھا۔ ہیروئن کے غیرت مند بھائی کو چھلانگ مارنے کے بعد پانچ منٹ میں صرف دو ڈائیلاگ بولنے تھے۔ یہ رول شاید زیادہ اہم نہیں تھا اور ایک نئے لڑکے کو دیا گیا تھا مگر وہ غائب تھا اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' ڈائریکٹر کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔ جب انجمن اور ولن کا میک اپ بھی ہوگیا تو ڈائریکٹر نے عادت کے مطابق اپنے گنجے سر کو دھوپ کی تمازت سے بچانے والا ہیٹ اٹھا کے نیچے مارا اور چلانے لگا "بتاؤ' اب میں کیا کروں۔ اس حرام زادے کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ اسے تو سب سے پہلے پہنچنا چاہیے تھا سیٹ پر۔ وہ نہ آیا تو میرا بیڑا غرق ہوجائے گا۔ سارا شیڈول بگڑ جائے گا۔ میڈم کے پاس کوئی ڈیٹ نہیں ہے دو ہفتے تک۔"

اس وقت اچانک کیمرا مین نے ڈائریکٹر کے کان میں کچھ کہا اور گرم حقے کی طرح گڑگڑ کرتا ڈائریکٹر خاموش ہوکے کرمو کی طرف دیکھنے لگا پھر اس نے سہلایا اور چٹکی بجا کے کرمو کو اپنے پاس بلایا۔ کرمو اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

ڈائریکٹر نے دونوں ہاتھوں کی دو انگلیوں اور دو انگوٹھوں سے فریم بنا کے کرمو کا جائزہ لیا "ڈیلی گیٹ چل سکتا ہے۔"

کیمرا مین نے کہا "میں تو کہتا ہوں سر' کسی کو پتا چل ہی نہیں سکتا۔ بالکل وہی چوکھٹا ہے۔"

کرمو کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جب انجمن نے کہا "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ دو ہی ڈائیلاگ ہیں۔ اسے چانس دے کر دیکھ لیں" تو کرمو کو یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہوجائے گا۔

"آخر اور کتنی دیر انتظار کریں اس..... کا" ہدایت کار کے نائب نے کہا۔

کیمرا مین پھر بولا "معمولی فرق میک اپ سے دور ہوجائے گا اور پھر میں لانگ شاٹ لوں گا تو..."

ڈائریکٹر نے اپنی کرسی پر گر کے ایک گہری سانس لی "اویار' پہلے اس بانگڑو سے تو پوچھ لو۔ کر سکتا ہے یہ کام؟"

خوشی سے کرمو کی ٹانگیں کانپنے لگی "میں.... کروں گا سر..."

ڈائریکٹر نے مطمئن انداز میں سہلا کے اپنے معاون کی طرف دیکھا "کٹی بیوٹی" کے ڈریس کا کیا ہوگا؟"

مستعد معاون نے کہا "وہ موجود ہے سر۔"

"بس تو پھر اسے ریڈی کرو" ہدایت کار نے کہا "جلدی۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا کرمو کے لیے ایک خواب کی طرح تھا۔ آدھے گھنٹے میں اس کے شاہی روغن آملہ ہیر آئل سے مہکتے بالوں کو شیمپو سے دھو کے صاف کردیا گیا۔ اس کے منہ کو رگڑ رگڑ کے صاف کیا گیا جس سے اس کا سرمہ بھی صاف ہوگیا۔ میک اپ کے بعد کپڑے بدل کے وہ ایکشن کے لیے تیار ہوگیا۔ معاون ہدایت کار نے اسے بڑی تفصیل سے سمجھا دیا تھا کہ اسے کہاں سے چھلانگ لگانی ہے اور چہرے سے کس قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کیا بولنا ہے۔

"اگر تم نے یہ سین اوکے کردیا تو کچھ پتا نہیں تمہاری تقدیر ہی بدل جائے۔ یہ کوئی معمولی ڈائریکٹر نہیں ہیں۔ ان کی ہر فلم ہٹ ہوتی ہے باکس آفس پر۔ تمہارا کام پسند آگیا تو ہو سکتا ہے کہ اگلی فلم میں رول مل جائے.... تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے۔ ایسے کس کو چانس ملتا ہے..."

معاون ہدایت کار بہت چالاک تھا اور کرمو کو بے وقوف بنا کے اپنے حسب منشا کام لینے کے لیے ایسی باتیں کر رہا تھا۔ کرمو کے لیے انجمن کے بھائی کا رول کرنا مجبوری تھا۔ اسے انجمن سے یہ بھی کہنا تھا کہ "تو جا بہنا" اب یہ شرعی مسئلہ تو بعد میں مولوی صاحب ہی حل کرسکتے تھے کہ کیا اس طرح کسی عورت کو بہن کہنے سے وہ بہن ہوجاتی ہے۔ انکار کرکے کرمو اپنا چانس نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ فلم تو فلم ہی ہوتی ہے۔ اس کا حقیقت سے کیا تعلق اور بفرض محال مولوی صاحب نے کہہ دیا کہ اب انجمن تمہاری بہن کی طرح ہے تو کوئی بات نہیں۔ اس جیسی نہ سہی مگر اپنی فردوس اور نغمہ' بہار اور زمرد بھی کم تو نہیں دل لگانے کو۔

ایک گھنٹے بعد کرمو ایک چٹان پر کھڑا تھا اور بہت پرسکون ہوچکا تھا۔ اس نے ہدایت کار کو مطمئن کرنے کا چیلنج قبول کرلیا تھا۔ انجمن آبشار کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ ولن ڈائیلاگ بولنے سے

لیے تیار ہو کے تالاب کے گوڈے گوڈے پانی میں اتر گیا۔ ہدایت کار نے چلا کے کیمرا مین اور یونٹ کے دوسرے لوگوں کو ہدایات دیں اور کہا "ایکشن۔"

کرمو بالکل تیار تھا مگر جب ڈائریکٹر نے ایکشن کہا تو اس کی نظر کچھ دور کھڑے ہوئے نیکے میراثی پر پڑ گئی جو اس طرف دیکھ کے مسکرا رہا تھا اور ہاتھ ہلا رہا تھا۔ کرمو خوشی اور غرور سے پھول گیا۔ فلموں میں اپنی زبردست اداکاری کا جو نمونہ وہ پیش کرنے والا تھا اس کا ایک چشم دید گواہ پیدا ہو گیا تھا۔ کل کو اسے جھوٹا کوئی قرار نہیں دے سکے گا۔ نیکے میراثی کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ کرمو ہی ہے' اس نے بھی مسکرا کے ہاتھ ہلا دیا۔

اس کے ساتھ ہی ڈائریکٹر چلانے لگا "کٹ... کٹ... اتنی دیر میں کیا سمجھایا ہے تم نے اس بانگڑو کو۔ یہ کدھر دیکھ رہا تھا' الو کا پٹھا۔"

معاون ہدایت کار نے گھبرا کے کہا "میں پھر سمجھاتا ہوں سر۔"

کرمو کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اسے پسینہ آ گیا۔ رہی سہی کسر ہدایت کار کے خطابات نے پوری کر دی۔ تاہم اس نے معافی مانگ کے دوسرے ٹیک میں سب ٹھیک کرنے کا وعدہ کیا۔ ڈائیلاگ اسے یاد تھے۔ "ایکشن" کے ساتھ ہی وہ اوپر سے تالاب میں کودا اور ولن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ولن نے ہیروئن کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور مکروہ قہقہے لگا رہا تھا۔ جب کرمو نے اس کے ہاتھ سے انجمن کا ہاتھ چھڑانے کے لیے ہیروئن کی گوری گوری کلائی پکڑی تو اس کے سارے جسم میں بجلی سی دوڑنے لگی۔ یہ خواب اور تصور سے بھی بہت دور کی حقیقت تھی جو کرمو کی زندگی کے ایک لمحے میں قید ہو گئی تھی اور یہ لمحہ پوری طرح کرمو کے تصرف اور اختیار میں تھا۔ اسے وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔

کرمو نے ایک بے خودی و سرشاری میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہ اداکاری نہیں تھی جس کے لیے کرمو کو شعوری کوشش کرنی پڑتی۔ بس اس نے فرض کیا کہ یہ اصل صورتِ حال ہے اور اس نے وہی کیا جو وہ کرتا۔ بالکل اسی طرح جیسے محفلِ سماع میں جذب کی کیفیت میں کسی پر حال طاری ہو جائے تو وہ وجد میں جھومنے لگتا ہے اور دیکھنے والوں کو یوں لگتا ہے کہ وہ رقص کر رہا ہے۔ خود رقص کرنے والے کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

چند منٹ کا شاٹ اوکے ہو گیا تو کیمرا مین نے اس کی پیٹھ پر شاباش دی "تم نے تو کمال کر دیا۔ کسی ریہرسل کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔"

فلم کے ولن نے بھی ہنس کے کہا "چلو یار گھوڑا نہ سہی' خچر کام آ گیا۔ گدھا بھی چل جاتا اس وقت تو۔"

کرمو نے برا نہیں مانا۔ اسے برا ماننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ڈائریکٹر نے فلم کے یونٹ کو پیک اپ کرنے حکم دے دیا تھا۔ وہ سب واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کرمو کو افسوس تھا کہ انجمن نے تعریف کرنا تو دور کی بات ہے اس کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا جیسے کرمو نام کی کوئی چیز ہی وہاں موجود نہیں تھی۔

ہدایت کار اور اس کا معاون دو افراد کے ساتھ ایک طرف بیٹھے چائے پی رہے تھے اور کسی اہم مسئلے پر گفتگو میں مصروف تھے۔ وہ بار بار نظر اٹھا کے کرمو کو دیکھتے تھے اور پھر بحث میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کرمو جو کچھ دیر پہلے اتنی اہمیت اختیار کر گیا تھا اب اچانک بے وقعت اور بے مصرف ہو گیا تھا۔

نیکے میراثی نے اس کے پیچھے آ کے کندھے پر ہاتھ مارا تو کرمو اچھل پڑا "اوئے تو۔ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"بس نظر بچا کے آ گیا" وہ بولا "شوٹنگ ختم ہو گئی ہے اس لیے کسی کو پروا نہیں۔ ہی یار' پیسے کتنے ملے۔"

"پیسے؟" کرمو نے سوچ کے کہا "اس کی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی' اور میں کون سا ایکٹر ہوں۔"

"چل انجمن کی بانہہ پکڑ لی۔ یہی بہت ہے" نیکے میراثی نے ٹھنڈی سانس لی۔

اچانک کرمو نے دیکھا کہ ہدایت کار نے چٹکی بجا کے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ باقی تین افراد کی نظریں... بھی کرمو کا ایسے جائزہ لے رہی تھیں کہ وہ نروس ہونے لگا۔

"میں تو کہتا ہوں سر جی۔ اس حرامی کی چھٹی کرو۔ تھوڑا سا کام ہوا ہے اس کا پھر کر لیں گے" نائب ہدایت کار نے کہا۔

"بھئی ہم سے پوچھو تو یہ لڑکا ہزار درجہ بہتر ہے" ایک عینک والے دھان پان شخص نے ڈبیا سے نکال کے پان منہ میں رکھا۔

نائب ہدایت کار نے کہا "اس نے پہلے بھی دو بار شیڈول خراب کیا ہے سر۔ اصل بات یہ ہے کہ اسے ضرورت نہیں۔"

ہدایت کار نے برہمی سے کہا "ضرورت نہیں کا کیا مطلب؟"

"او جی کھاتے پیتے ماں پیو کا پتر ہے۔ ایویں شوق میں پہنچ گیا تھا آپ کے پاس۔" فلم کے موسیقار نے کہا۔

"اوئے۔ کیا نام ہے تمہارا؟" ہدایت کار نے کرمو کو مخاطب کیا۔

"کرمو... کرم داد جناب عالی۔"

"کام کرو گے فلم میں؟"

کرمو کے کانوں میں جیسے بم کا دھماکا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر سن کھڑا سوچتا رہا کہ یہ سوال اس سے مذاق میں کیا گیا ہے یا سنجیدگی سے۔ یہی ہدایت کار ابھی کچھ دیر پہلے اسے گالیاں دے رہا تھا اور بانگڑو کا خطاب بھی عطا کر چکا تھا۔ اس سوال کے دو جواب ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ کرمو چلا چلا کے ہاں کہنا چاہتا تھا مگر درمیان میں بہت سے خیال تھے جو اس کی زبان پر کانٹوں کی طرح اگ آئے تھے۔ اس کی

بیوی عائشہ' نابینا ابا' چاچے دی ہٹی۔

"اوئے سوچ کیا رہے ہو بے وقوف!" نائب ہدایت کار نے اسے جھنجوڑ کے کہا "بڑے خوش قسمت ہو تم کہ اتنے بڑے ڈائریکٹر نے تمہیں یہاں آفر کی ورنہ لاہور جاکے دیکھو' سیکڑوں دھکے کھاتے پھرتے ہیں اور گیٹ کیپر ڈنڈے مار مار کے بھگا دیتا ہے۔ کامیاب ہوگئے تو عزت' شہرت' سب مل جائے گی۔"

"نہ ملے تو آجانا واپس خیر سے لوٹ کے اپنے گھر کو۔" فلم کے مصنف نے مذاق کیا اور خود ہی ہنسا۔

"میں کام کروں گا جناب۔" کرمو کی زبان ایک دم کھل گئی۔ "میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔"

ہدایت کار نے اپنے معاون سے کہا "اسے پانچ ہزار دے دو اور پتا سمجھادو' کل پہنچ جائے۔"

"یہ ایڈوانس ہے سر؟"

ہدایت کار نے سر ہلایا "آج کے کام کا معاوضہ بھی شامل ہے اس میں۔"

کرمو نے پانچ ہزار کے نوٹ پکڑے تو اس سے چند قدم کے فاصلے پر نیکا میراثی پھٹی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے کرمو سے ہونے والی ساری گفتگو بھی سنی تھی۔ صدمے اور حیرت سے اس کا ہارٹ فیل ہونے والا تھا۔ خوش قسمتی کے قصے اس نے بہت سنے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ خود کب سے فلمی دنیا میں گھسنے کے لیے خوار ہو رہا تھا۔ آج تک اسے کسی اسٹوڈیو کے بند گیٹ سے آگے جانے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک ہدایت کار' ایک ہیرو اور ایک ڈسٹری بیوٹر کی گاڑی کے آگے بھی لیٹ چکا تھا مگر ہر بار بچ گیا تھا۔ پولیس نے اسے دو چار دن ٹھونک بجا کے چھوڑ دیا تھا۔ وہ دس سال سے سرکس کے باہر ڈھول بجا رہا تھا۔ ایک بار وہ کرمو کو سرکس دکھانے لے گیا تھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ آج اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے جو کچھ ہوا تھا وہ ناقابلِ تصور' ناقابلِ یقین اور ناقابلِ برداشت' وہ پلٹ کے ایک دم گاؤں کی طرف بھاگا۔

کرمو کے گھر پہنچنے تک نیکے میراثی کی خبر رساں ایجنسی کے ذریعے سیدپور کے ہر شخص کو معلوم ہوگیا تھا کہ کرم داد اب انجمن کے ساتھ فلم میں کام کرے گا اور اسے فلم والوں نے پورے پانچ ہزار نقد ادا بھی کردیے ہیں۔

گاؤں میں جس نے سنا صدمے سے دم بخود رہ گیا۔ صدمے کی نوعیت سب کے لیے مختلف تھی۔ گاؤں کے نوجوانوں کو صدمہ تھا کہ یہ چانس انہیں کیوں نہیں ملا۔ آخر ان میں کیا کمی تھی اور کرمو میں ایسی کیا بات تھی کہ قسمت نے اسے فرش سے اٹھا کے خوابوں کی تعبیر کے عرش پر پہنچا دیا۔ پرانے بزرگوں کو صدمہ تھا کہ ایک کمہار کے بیٹے نے باپ دادا کے نام کو بٹا لگا دیا۔ باپ پہلے کون سا عزت دار تھا مگر جب سے اس نے "چاچے دی ہٹی" کھولی تھی' اسے معزز سمجھا جانے لگا تھا۔ فلموں میں جاکے بیٹے نے شرم و حیا کا جنازہ نکال دیا تھا اور اپنی عاقبت خراب کرلی تھی۔ گاؤں کے نام کو رسوا کردیا تھا۔

کرمو کے باپ کو بہت سے صدمے تھے۔ ایک یہ کہ اب "چاچے دی ہٹی" کا کیا ہوگا۔ وہ خود نابینا ہوجانے کے بعد یہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ دوسرا صدمہ اپنی جگ ہنسائی کا تھا۔ پانچ ہزار کا سن کے البتہ اس صدمے کی شدت میں کمی آگئی تھی اور وہ سوچنے لگا تھا کہ کرمو ہزاروں کمانے لگے گا تو وہ گاؤں پر لعنت بھیج کے اس کے پاس شہر چلا جائے گا۔ آخری صدمہ اسے اپنے نابینا ہونے کا تھا۔ اگر کرمو ہیرو بن گیا تو وہ اس کی فلمیں کیسے دیکھے گا۔

سب سے شدید صدمہ عائشہ یعنی آشی کو ہوا تھا۔ اس کی نظر میں تو دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ اسے اندیشہ ضرور تھا مگر اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ فلموں کا شوقین اور انجمن کا عاشق' کرمو اسے چھوڑ کے لاہور بھی جا سکتا ہے اور سچ مچ ہیرو بھی بن سکتا ہے۔ اس نے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارا اور کمرے میں گھس کے رونے لگی۔ وہ جیتے جی بیوہ ہوگئی تھی۔ اس کا بچہ یتیم ہوگیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کرمو ایک بار لاہور گیا تو پھر کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔ وہ فلم میں کام کرنے والیوں کے جال میں پھنس جائے گا۔ وہ تو روز خصم بدلتی ہیں۔ حیا شرم کے نام سے واقف نہیں ہوتیں۔ خیر' وہ بھی آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔ سارے خاندان اور گاؤں کے سامنے نکاح ہوا تھا اس کا کرمو سے۔ وہ کرمو کے ساتھ لاہور جائے گی۔ کسی گشتی نے اس کی طرف بری نظر سے دیکھا تو وہ اس کی آنکھیں نوچ لے گی۔

کرمو گھر میں داخل ہوا تو فلم کا معاون ہدایت کار بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ کرم داد کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی کی نیت کا کیا بھروسا۔ بعد میں اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ لاہور نہ پہنچا تو کسی کو پانچ ہزار وصول کرنے کے لیے یہاں بھیجنا تو پڑے گا پھر کرمو نے اسے بتایا تھا کہ اس کے کمہار باپ نے اپنی فنکارانہ تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور بہت سی چیزوں کے علاوہ ایک ٹرین بنائی تھی۔ ٹرین کا انجن' بوگیاں اور ریل کی پٹڑی' سب مٹی کے بنے ہوئے تھے اور یہ کھلونا ٹرین ایک دائرے میں چلتی بھی تھی۔ اس کے لیے ایک کمرا مخصوص تھا کیونکہ سیدپور آنے والے سب لوگ یہ چیز دیکھنے ضرور آتے تھے یا لائے جاتے تھے۔ وہ بھدی بے ہنگم ٹرین کو دیکھ کر مایوس ہوتے تھے۔ اس میں نفاست یا کاریگری کا حسن جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ کرمو اسے زبردستی دھکیل کر چلاتا تھا اور پکنک منانے یا سیر کرنے کے لیے سیدپور پہنچنے والے خوش حال لوگ اخلاقاً اس کی تعریف کرتے تھے اور مروت میں پانچ دس یا سو پچاس روپے انعام میں بخش جاتے تھے۔

کرمو کا باپ کچے صحن میں بان کی چارپائی پر بیٹھ کے حقہ

گڑگڑا رہا تھا۔ کرمو نے معاون ہدایت کار کو بتایا "یہ میرا ابا ہے۔ بڑا مانا ہوا کمہار تھا مگر پھر ہاتھ کو لقوہ مار گیا تو اس نے پرچون کی دکان ڈال لی۔"

تعارف کی رسمی کارروائی ختم ہونے سے پہلے وہ بولا "اوئے کرمو۔ تو نے فلم میں کام کیا ہے۔ اس زنانی کے ساتھ' بے شرم۔"

کرمو نے کہا "تجھے کس نے بتایا؟"

"اور سنا ہے تو لاہور بھی جا رہا ہے۔ فلموں میں ناچے گا' گائے گا بے حیا عورتوں کے ساتھ۔"

کرمو نے معاون ہدایت کار کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا "فلمیں تو بھی دیکھتا تھا ابا' شہر جا کے۔"

وہ بھڑک اٹھا "مگر میں نے ہاتھ نہیں لگایا کبھی پرائی عورت کو۔ فیکے میراثی نے مجھے بتایا ہے..."

"وہ بکواس کرتا ہے ابا...." کرمو سمجھ گیا کہ انجمن کی کلائی پکڑنے کی خبر اتنی جلدی گاؤں میں کیسے پھیلی تھی۔

"تجھے پانچ ہزار روپے بھی ملے ہیں؟"

کرمو نے پھر معاون ہدایت کار کو اشارے سے منع کر دیا "یہ بھی اسی نے بتایا ہوگا' جھوٹ بکتا ہے وہ۔"

"تو جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے۔ تو اپنی زنانی کو دے گا۔"

"بے شک ان سے پوچھ لو ابا۔ یہ میرے ساتھ آئے ہیں۔ فلم کے ڈائریکٹر صاحب۔"

"ڈاکٹر صاحب...؟"

معاون ہدایت کار بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ "وہ جی۔ ابھی ویسے تو نہیں ہیں مگر ملیں گے۔ اس سے بھی زیادہ ملیں گے انشاء اللہ۔ لاکھوں ملیں گے۔"

"لاکھوں؟" کرمو کے باپ کا منہ کھل گیا۔

"ہاں.... اگر قسمت نے ساتھ دیا اور یہ کامیاب ہو گیا۔ کرمو' مجھے جانا ہے۔ تم مجھے کیا دکھانے لائے تھے؟" معاون ہدایت کار نے کہا۔

"ہاں جی۔ آؤ' اندر چل کے دیکھو۔"

کرمو کے باپ نے حقے کا کش لے کر کھانستے ہوئے کہا "میں نے بنائی تھی جناب یہ ٹرین۔ جادو تھا میرے ہاتھوں میں۔ ولایت سے گورے آتے تھے مٹی کی چلتی ہوئی ٹرین دیکھنے۔ آپ کو جو انعام دینا ہو مجھے دینا۔ پچھلی بار جو فلم کے ڈاکٹر صاحب آئے تھے' پورے سودے کر گئے تھے۔"

بند کمرے کا دروازہ کھولتے ہی کرمو نے آشی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں رونے سے لال ہو رہی تھیں۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اوڑھنی پیروں میں پڑی تھی۔ وہ لال بھبوکا ہوئی ایک ہاتھ کمر پر ایسے رکھے کھڑی تھی کہ نیچے سے اوپر تک اس کے جوان بدن کے سارے نشیب و فراز اور پیچ و خم بڑی پر غرور شوخی اور بے باکی کے ساتھ نکھر کر سامنے آ گئے تھے۔ یہ سید پور کی پہاڑیوں میں قلانچیں بھرنے والی ہرنی جیسی معصوم لڑکی کا بدن تھا جسے دستِ قدرت نے بڑی فیاضی سے تناسب اور نزاکت کی رعنائی عطا کی تھی مگر جیسے سید پور کے مرغزاروں' آبشاروں اور کوہساروں کا حسن گمنامی اور نا آشنائی کی دھند میں کھویا ہوا تھا' ایسے ہی آشی اپنے ساحر حسن اور غارت گر شباب کی طاقت سے بے خبر کرم داد کی بیوی بنی خاموشی سے جی رہی تھی۔

غیر مرد کو سامنے دیکھتے ہی آشی نے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کے کہا "ہائے میں مرگئی" اور شاخِ گل کی طرح لچک کے جھکی۔ گورے نازک پیروں میں پڑی ہوئی چنری کو اٹھایا اور بل کھا کے باہر نکل گئی۔ معاون ہدایت کار کی خیرہ ہو جانے والی نگاہوں کے سامنے ایک برق سی لہرائی جس نے اس کے خرمنِ عقل و ہوش کو جلا کے خاکستر کر دیا۔

کرمو نے جھکے جھکے کہا "جناب' یہ ہے وہ گڈی۔ میں آپ کو چلا کے دکھاتا ہوں۔"

معاون ہدایت کار چونکا "آں.... ہاں' اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے..... مگر یہ کون تھی۔"

کرمو نے سر اٹھایا "کون جی؟"

"یہ لڑکی.... جو ابھی یہاں سے نکل کر گئی ہے؟"

کرمو ہنس پڑا "لڑکی نہیں جی' وہ میری بیوی تھی۔ باہر ابے کی چارپائی پر جو بچہ سو رہا تھا' اس کی ماں۔"

"بہت غصے میں تھی۔"

"ہاں جی' بہت ناراض ہو گی مجھ سے۔ ابا کی تو خیر ہے مگر آشی تو زندہ نہیں چھوڑے گی مجھے۔ یہاں کسی سے ہنس کے بات کر لوں تو میری جان کو آ جاتی ہے۔ فلموں کا سنے گی تو مت پوچھو.... مگر جناب' پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ اس میں سے چار ہزار رکھوں گا اس کے ہاتھ پر.... کہوں گا جا گہنے بنوا لے اپنے۔ تو اتر جائے گا سارا غصہ۔ ہزار تو مجھے بھی چاہئیں۔"

معاون ہدایت کار باہر دیکھتا رہا "کمال ہے۔"

"کیا کمال ہے جی۔"

"بہت کم عمر میں شادی ہو گئی اس کی.... لڑکی لگتی ہے بالکل۔"

"ایسے ہی ہوتا ہے جی یہاں۔ ابھی انیس کی ہوئی ہے۔ یا شاید ہونے والی ہے رمضان کے چاند میں۔" کرمو نے کہا۔

"کرمو۔ تم لاہور آ رہے ہو نا؟"

"ہاں جی۔ کل شام کو پہنچ جاؤں گا۔ ادھر میرا ایک یار ہے۔ اس کا پتا ہے میرے پاس' وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ بسترا میں ساتھ لے آؤں گا۔"

معاون ہدایت کار مسکرایا "رہائش کی فکر مت کرو۔ تمہیں فرنشڈ کوٹھی کا ایک حصہ مل جائے گا.... سب کچھ ہوگا وہاں۔ ضرورت کی ہر چیز ہوگی۔ ٹی وی' فریج' اے سی' آنے جانے کے

لیے گاڑی۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے' اپنی بیوی کو..... کیا نام ہے اس کا...؟"

"عائشہ۔ سب آشی کہتے ہیں۔"

"ہاں آشی کو بھی اپنے ساتھ لے آؤ۔ دراصل آج کل نئی فلمیں بہت بن رہی ہیں اور انڈسٹری کو نئے چہروں کی بہت ضرورت ہے۔ کیا حرج ہے اگر آشی کو بھی چانس مل جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا چہرہ فوٹو جینک ہے اور یہ جو ہدایت کار ہیں' کئی نئے چہرے متعارف کرائے ہیں انہوں نے جو آج ٹاپ کی ہیروئن کہلاتی ہیں۔"

کرمو خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ "میں آپ کی بات کو غلط نہیں کہتا جی لیکن آپ نے دیکھا' میرے فلم میں کام کرنے کی بات کا یہاں کیا اثر ہوا؟ اور ابھی تو کچھ نہیں' آپ کے جانے کے بعد پتا نہیں کتنے لوگ آئیں گے۔ میرے ماے' چاچے اور گاؤں کے بزرگ۔ وہ سب مجھے شرمندہ کریں گے اور اس برائی سے روکنے کی کوشش کریں گے۔"

"تم سمجھا سکتے ہو انہیں۔"

"میں کسی کی پروا نہیں کرتا کیونکہ میں مرد ہوں۔ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے کوئی' لیکن آشی کی بات اور ہے۔ وہ عورت ذات ہے' خاندان کی عزت ہے اور گاؤں کی آبرو ہے۔ وہ بیوی ہے میری اور..... کاکے دی ماں ہے۔ خود میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ آشی فلموں میں وہ سب کرے.....جو ہوتا ہے۔"

معاون ہدایت کار نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا "کیا عجیب جہالت کی بات ہے۔ اچھائی برائی تو آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ جو کام تمہارے لیے خراب نہیں' وہ تمہاری بیوی کرے تو اس میں بے عزتی کی کون سی بات ہے۔"

"ہے جناب۔ میری چھوڑو' ایسی بات سن کے سب سے پہلے تو میرا ابا دہائی مچائے گا۔ میری ماں چیخ چیخ کے آسمان سر پر اٹھالے گی پھر آشی کے گھر والے آئیں گے۔ مار مار کے وہ میری ہڈیاں توڑ ڈالیں گے۔"

معاون ہدایت کار نے برہمی سے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ آخر کیا ضرورت ہے تمہیں سب کو بتانے کی۔ بھئی وہ بیوی ہے تمہاری تو کیا اسے تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔ اپنے ساتھ بس میں بٹھاکے اسے بھی لاہور لے آؤ۔ بات ختم' خواہ مخواہ کے جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بعد میں جب تم ہیرو بن جاؤ گے اور وہ مشہور فلمی ہیروئن ہوگی تو یہی لوگ فخر کریں گے۔ چکر لگائیں گے تمہاری کوٹھی کے... مگر ان کو قریب کون پھٹکنے دے گا۔ یہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تمہارا۔"

"یہ تو پتا نہیں جی کہ کل کیا ہوگا' مگر آج کا مجھے پتا ہے کہ میرے ساتھ لاہور جانے والی بات پر وہ بہت خوش ہوگی مگر میں نے اس سے کہا کہ تم بھی فلموں میں کام کرو تو معلوم ہے کیا ہوگا...؟"

"کیا ہوگا؟"

"وہ غصے میں پاگل ہوکے میرا منہ نوچ لے گی۔ گالیاں دے گی مجھے کہ میں بے غیرت ہوں۔ بیوی کی کمائی کھانے والا۔"

معاون ہدایت کار مسکرانے لگا "شاید ایسا نہ ہو۔ تم اس سے بات کرکے دیکھو ایک بار۔"

"اپنی بیوی کو میں زیادہ سمجھتا ہوں یا آپ زیادہ جانتے ہیں؟" کرمو اس کی مسکراہٹ سے چڑ گیا۔

"ایسا بھی ہوتا ہے کرم داد۔ ساری عمر ساتھ رہ کے شوہر کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ اس عورت کو سمجھتا ہے جو اس کی بیوی ہے۔ عورت کو آج تک کسی نے بھی سمجھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ فلم اب سنیما میں نہیں گھر گھر میں دیکھی جاتی ہے۔ دولت' شہرت' عزت کی آرزو کسے نہیں۔ ہر گاؤں کی لڑکی ہیروئن بننے کے خواب دیکھتی ہے۔"

"مجھے صرف اپنی بیوی کے بارے میں معلوم ہے جناب کہ میں نے اسے مجبور کیا اور اس کی مرضی کے خلاف زبردستی اسے فلموں میں کام کرنے پر مجبور کیا تو وہ میری جان لے لے گی یا اپنی۔ کسی کنوئیں میں کود کے مرجائے گی۔ چلیں میں آپ کو لسّی پلاؤں۔"

"نہیں۔ اس وقت لسّی کا کوئی موڈ نہیں۔" معاون ہدایت کار نے کہا "میں چلتا ہوں۔"

"میں چھوڑ آؤں آپ کو گاڑی تک۔"

"تھینک یو۔ اتنے مشکل راستے نہیں ہیں سید پور کے۔ پہلے بھی آچکا ہوں' میں چلا جاؤں گا" معاون ہدایت کار نے کہا۔

صحن سے گزرتے ہوئے اس نے کرم داد کے نابینا باپ کو سو کا ایک نوٹ دیا اور اس کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مٹی کی ریل گاڑی کی بہت تعریف کی جو اس نے آشی کے حسن کی چکاچوند میں ٹھیک سے دیکھی بھی نہیں تھی۔

اسے یقین تھا کہ آشی گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہیرا تھی جسے اس کی نگاہ نے حسنِ اتفاق سے تلاش کرلیا تھا۔ اگر وہ فلموں میں آجاتی تو اس کی یہ دریافت بہت جلد فلمی دنیا کے آسمان کا وہ روشن ستارہ بن کے جگمگاتی جس کے سامنے بہت سی ہیروئنوں کے چراغ گل ہوجاتے۔ جس ملک میں چالیس سال اور اس سے بھی زیادہ عمر کی بھاری بھرکم عورتیں صرف اپنے جسم کی نمائش اور ادافروشی سے گاؤں کی الھڑ مٹیار کے رول میں کامیاب ہوں وہاں انیس سال کی آشی جیسی حسین اور متناسب بدن والی لڑکی یقیناً دلوں پر قیامت ڈھا سکتی ہے۔ اس کا احمق اور جذباتی شوہر اسے لڑکی ماننے کو ہی تیار نہیں۔ فلمی دنیا میں راج کرنے والی "کنواری" ہیروئنوں کا اصل حساب تو میدان حشر میں ہی سامنے آئے گا کہ انہوں نے کس کس کے کتنے بچے جن کے کہاں کہاں چھوڑ دیے تھے۔

وہ گاؤں کے آخری حصے میں تھا کہ اچانک اس کے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ ایک چٹان کی اوٹ سے آکے لگنے والے کنکر نے

اسے گھوم کر دیکھنے پر مجبور کر دیا پھر اسے آشی کا مسکراتا چہرہ نظر آیا اور وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ اسے اشارے سے ایک چٹان کی اوٹ میں بلا رہی تھی۔

"تم.... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" معاون ہدایت کار نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"میں انتظار کر رہی تھی تمہارا" آشی نے اپنی تیز سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"تم بھاگتی ہوئی آئی ہو؟"

آشی نے نظریں اٹھائیں اور آہستہ سے اقرار میں سرہلایا "میں نے سوچا کہیں تم نکل نہ جاؤ۔"

معاون ہدایت کار کے لیے اب شک و شبے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اس کا چلایا ہوا تیر نشانے پر جا لگا تھا مگر ایک آنکھوں کے اندھے کی اولاد عقل کے اندھے کرمو کی نظر یہ دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں پر فرسودہ روایات اور پرانے خیالات کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کا یقین کھوکھلی بنیادوں پر استوار تھا۔

وہ بے وقوف آج بھی یہ سمجھتا تھا کہ ہر عورت صرف ماں ہوتی ہے یا بہن ہوتی ہے' بیٹی ہوتی ہے یا بیوی ہوتی ہے۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس کا باپ کمہار تھا اور وہ سید پور میں چاچے دی ہٹی پر بیٹھ کے گڑ' تمباکو اور کھل سوڈی بیچتا تھا۔ اسے دولت کی قوتِ خرید اور خواہشوں کے آسمان کی وسعت کا اندازہ کیسے ہو سکتا تھا۔

"تم کچھ کہنا چاہتی ہو مجھ سے؟" معاون ہدایت کار نے عیاری سے کہا۔

"ہاں.... ابھی تم جو کرمو سے کہہ رہے تھے.... میرے بارے میں" اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

"آئی سی۔ تم بھی فلموں میں کام کرنا چاہتی ہو؟"

آشی نے پھر پلکیں اٹھائیں تو معاون ہدایت کار کو یوں لگا جیسے دن کچھ زیادہ روشن ہو گیا ہے "آپ نے..... آپ کہہ رہے تھے نا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آشی.... لیکن تمہارا شوہر۔"

"اس کی آپ فکر مت کرو۔ میں راضی کر لوں گی اسے۔" آشی نے چنری کے ایک کونے کو انگلی پر لپیٹتے کھولتے کہا۔

"کیسے راضی کر لوگی.... وہ تو سمجھتا ہے..."

"آپ اس کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ' میں ہیروئن بن سکتی ہوں' انجمن کی طرح۔ مجھے ڈانس کرنا تو نہیں آتا..... مگر میں سیکھ لوں گی۔ کرمو مجھے روک نہیں سکتا۔ وہ کیا سمجھتا ہے' اکیلا عیش کرے گا لاہور جا کے۔ میں یہاں بڑی سڑتی رہوں گی اس کے انتظار میں۔ خدا نے مجھے خوب صورت بنایا ہے اور موقع دیا ہے تو میں فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

معاون ہدایت کار اسے بڑی محویت اور حیرت سے دیکھ رہا تھا

"نہیں... غلط کیا ہے اس میں۔"

"آپ نے پانچ ہزار دیے ہیں اسے۔ مجھے کتنے پیسے ملیں گے؟"

"تم لاکھوں بھی کما سکتی ہو۔ جیسے انجمن کماتی ہے" معاون ہدایت کار نے اپنی جیب میں سے پرس نکالا "یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پر میرا پتا بھی لکھا ہوا ہے اور فون نمبر بھی ہے۔ کیا تم لاہور آ سکتی ہو؟"

"لاہور تو میں کرمو کے ساتھ ہی آؤں گی دیکھ لینا" اس نے کارڈ پکڑ کے دیکھا اور پھر وہاں چھپا لیا جہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ سید پور کی دو پہاڑیوں کے درمیان کسی تاریک غار جیسی جگہ تھی جس کے تصور سے معاون ہدایت کار کے ذہن میں برگِ گل کا ریشمی لمس' گھنے جنگلوں میں شبنم کی مہک اور بارش سے بھیگی زمین پر دھوپ کی تمازت کا تصور آتا تھا۔

معاون ہدایت کار نے دامِ آرزو کو ڈھیلا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا "یہ رکھ لو اپنے پاس" اس نے پرس سے دو ہزار روپے نکال کے رازدارانہ انداز میں آگے بڑھائے۔

آشی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی "یہ کس لیے جی....؟"

"بھئی تمہیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ لاہور میں.... جب فلموں میں کام کرنے کے پیسے ملیں گے تو واپس کر دینا۔" معاون ہدایت کار پر گھبراہٹ سوار تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ منظر کرمو یا اس کے کسی چاچے ماے نے دیکھ لیا تو اس کی خیر نہیں۔ وہ کسی طرح نکل بھی گیا تو کچھ پتا نہیں پرانے وقتوں کے قبائلی معاشرے کی اخلاقی قدروں کو صرف عورتوں پر مسلط رکھنے والے مرد آشی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔

آشی نے دزدیدہ نظروں سے معاون ہدایت کار کو دیکھا اور ایک غمزۂ غماز کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کی چوڑیاں ہنسنے لگیں۔ آشی نے دو ہزار مٹھی میں دبائے اور چوڑیوں کی ہنسی کو دبا دیا "کرمو کو کچھ مت بتانا..."

معاون ہدایت کار مسکرایا "فکر مت کرو۔ تم بھی جب لاہور آؤ تو صرف مجھ سے ملنا۔ تمہیں جو جگہ رہائش کے لیے فراہم کی جائے گی وہاں ٹیلی فون ہو گا۔ پہلے مجھ سے بات کر لینا۔ ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ فلمی دنیا میں کیا ہوتا ہے۔ سب لوگ کہیں بھی اچھے نہیں ہوتے۔ ناواقف آدمی' ہر جگہ لٹ جاتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات..... لیکن تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو۔"

اس نے پیر کے انگوٹھے سے مٹی کریدی "جی..... آپ اچھے آدمی ہو۔"

معاون ہدایت کار نے جذبات کے طوفانی ریلے کو قابو میں رکھا ورنہ اس کا دل شدت سے مچل رہا تھا کہ وہ اسی وقت خود کو اچھا آدمی ثابت کر دے۔ آخر وہ پورے دو ہزار خرچ کر چکا تھا مگر زیرِ دام آنے سے پہلے ہی سنہری چڑیا پھر سے اڑ جاتی تو یہ عقلمندی نہ

ہوتی۔

عائشہ اسے گاڑی میں بیٹھ کے جاتا دیکھتی رہی۔ اس نے کار کو درختوں سے ڈھکی سڑک پر غائب ہوتے دیکھا اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتی واپس لوٹی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی اور ہے۔ انجمن ہے یا فردوس ہے یا نغمہ ہے۔ جن کی رنگین تصویریں اس نے کرمو کے پاس بہت دیکھی تھیں۔

خود کرم داد کے لیے اب سید پور میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ وہ اڑ کے لاہور پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کتنی مخالفت کا سامنا ہوگا۔ وہ سارا دن باہر پھرتا رہا۔ رات گئے وہ گھر پہنچا تو صحن میں بہت سے لوگ اس کے ابا کو گھیرے بیٹھے تھے۔ کرم داد کے سارے چاچے مامے اور اس کا سالا' سسر ایک ہنگامی اجلاس میں شریک تھے جس کی صدارت کے فرائض مولوی صاحب نے خود ہی سنبھال لیے تھے۔ اپنے اپنے غیظ وغضب کا اظہار کرنے کے بعد مجرم یعنی کرم داد کو حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ کرم داد روٹی کھا کے کمرے سے مونچھیں صاف کرتا ہوا نکلا۔

ابھی مولوی صاحب نے تمہید باندھی ہی تھی کہ کرمو نے انہیں ٹوک دیا "دیکھو جی مولوی صاحب۔ ہم بڑی عزت کرتے ہیں تمہاری۔ بہت چھوٹے تھے تب سے تمہارے پاس سپارے پڑھنے آتے تھے۔ ہمارا منہ مت کھلواؤ۔ تم نے ہم سے کیسے کام کرائے' بہت لوگ جانتے ہیں۔"

مولوی صاحب نے عالم اشتعال میں کانپنا شروع کیا "اولادِ خر۔ نطفۂ ناتحقیق۔ بزرگوں پر بہتان تراشی کرتا ہے۔"

"کیوں؟ مجھے آپ نے نہیں بھیجا تھا پیغام دے کر.... ماسی زلفاں کے گھر.... کہ تمہارے ہاتھ کی کھیر کھائے بہت دن ہو گئے اور اس نے جو کھیر بھیجی تھی اس میں ڈال دیا جمال گوٹا۔ پورا دن لنگی دھوتے تھے اور پہنتے تھے۔"

مولوی صاحب کی مغلظات حاضرین کے گستاخ قہقہوں میں دب گئیں۔

"اور بلاؤں فیکے میراثی کو؟" کرمو نے دھمکی دی "اس کی بیوی کو کیا کہلوایا تھا آپ نے؟ حجرے میں آ کے ذرا بدن دبا دیا کر۔ سنا ہے تو مالش بڑی اچھی کرتی ہے۔ فیکا میراثی خود بتائے گا کہ اس نے کیسی مالش کی تھی اور کیا زبردست کٹ لگائی تھی۔"

مولوی صاحب کو احتجاجاً واک آؤٹ کرنے کے لیے مزید شہادتوں کی کوئی ضرورت نہ پڑی۔ محرم رازِ درونِ میخانہ کرم داد نے ایک ایک کر کے ہر تائے چاچے اور مامے کو اس کی فردِ جرم سب کے سامنے تھمادی۔ بیشتر الزامات کا تعلق بھی تعلقات سے تھا جو ساری دنیا کی نظر سے پوشیدہ تھے مگر کرمو اور اس کے یاروں نے پہاڑیوں اور غاروں' جھاڑیوں اور چٹانوں کے پیچھے گھومتے پھرتے اور کھیلتے کودتے بہت کچھ دیکھا تھا۔ اگر کرمو نام بھی لیتا تو یہ بات یقینی تھی کہ اس رات گاؤں کی آدھی آبادی کے ہاتھوں باقی آدھی آبادی قتل ہو جاتی اور مرحومین میں حضرات اور خواتین کی تعداد برابر ہوتی۔ نوجوانوں سے عمر رسیدہ بزرگوں کی تعداد زیادہ ہوتی اور ہر خاندان کے شجرۂ نسب میں رسوائی کی ملاوٹ سے سب کے سر جھک جاتے اور مونچھیں نیچی ہو جاتیں۔

جو مدعی بن کے آئے وہ ملزموں کی طرح ایک دوسرے سے نظر چراتے اور سچ کو جھوٹ قرار دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے اور گالیاں بکتے رخصت ہو گئے تو کرم داد کے سامنے صرف تین افراد رہ گئے۔

کرم داد کے سسر نے محبت آمیز شفقت سے کہا "او پتر۔ تو نے جو کرنا ہے کر لیکن سب کو بے عزت نہ کر۔"

کرم داد نے کہا "او جی ایسے عزت دار بہت دیکھے ہیں میں نے لیکن میں نے آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔"

اس کے برادرِ نسبتی نے کرم داد کو آنکھ مار کے مونچھوں پر تاؤ دیا "او یار۔ ہمارا بھی خیال رکھنا۔ کوئی رول ہو ہیرو کا تو بلالینا چٹھی لکھ کے۔"

کرمو کے ابا نے کہا "اوئے سؤر دے پتر۔ تو چلا جائے گا تو یہ چاچے دی ہٹی کون چلائے گا' تیرا باپ؟"

"چاچے دی ہٹی پر چاچے کو بٹھا دو۔ سانڈ کی طرح پھرتا رہتا ہے گاؤں میں۔"

"وہ کھا جائے گا ساری دکان بیچ کے۔ مجھے ایک پیسہ نہیں دے گا۔"

"دفع کر ابا۔ اب تو پیسے کی فکر کیوں کرتا ہے" کرم داد نے سینہ تان کے کہا۔

کرم داد کو خلافِ توقع سب سے شدید مزاحمت کا سامنا عائشہ کی طرف سے کرنا پڑا۔ وہ اپنے باپ اور بھائی کی موجودگی میں اس کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔

"تو نے فیصلہ کر ہی لیا ہے فلموں میں کام کرنے کا تو میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی۔"

"جھلی ہو گئی ہے کیا۔"

"تو جھلا ہو گیا ہے کہ لاہور جا رہا ہے بیوی بچوں کو چھوڑ کے۔"

کرمو نے کہا "مرد تو ولایت اور دبئی بھی جاتے ہیں۔"

"عورتیں بھی جاتی ہیں" عائشہ اڑ گئی "اور لاہور' نہ ولایت ہے نہ دبئی۔ بس میں بیٹھ کے پچاس روپے خرچ کر کے کوئی بھی جا سکتا ہے۔"

کرمو کے سالے نے کہا "بہن ٹھیک کہتی ہے۔"

"خاک ٹھیک کہتی ہے۔" کرمو نے برہمی سے کہا "یہاں گھر میں کیا تکلیف ہے اسے' ابا کا خیال کون رکھے گا۔"

"ابا کا تجھے بڑا خیال ہے۔ میں تو کہتی ہوں ابا کو بھی ساتھ لے چل۔ وہاں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں گے ابا کی آنکھیں۔"

"بہو ٹھیک کہتی ہے....." ابا نے کہا "بس فیصلہ ہوگیا۔"

"اباجی آپ بھی سٹھیا گئے ہو۔ فیصلہ کیسے ہوگیا۔ لاہور میں میری کون سی پکی نوکری لگی ہے۔ رہنے کی جگہ کا ابھی پتا نہیں" کرمو نے چلاکے کہا۔

"تو خود کہاں رہے گا' سڑک پر؟" عائشہ نے کہا۔

"ہاں سڑک پر بھی سو سکتا ہوں میں" سسر محترم اور سالے کی وجہ سے کرمو نے اپنی منکوحہ کو جھانپڑ رسید کرنے سے گریز کیا حالانکہ وہ اس پر قطعی معترض نہ ہوتے۔ دیہاتی معاشرے کے قوانین کی رو سے ہر شوہر کو بہت سے بنیادی حقوق حاصل تھے۔ ان میں جھانپڑ مارنے کا حق سب سے پہلے تھا۔

"فلم میں کام کرنے والے سڑک پر نہیں سوتے۔" کرمو کے باخبر سالے نے بڑے وثوق سے کہا "تجھے کوئی جگہ ضرور دیں گے فلم والے۔"

"اویار' ایک کمرا کوٹھری دے دیا ابھی تو اس میں سب کیسے رہ سکتے ہیں' سوچنے کی بات ہے۔"

عائشہ نے ایک دم جھوٹ کا بھانڈا پھوڑ دیا "فیکے میراثی نے بتایا ہے کہ تجھے کوٹھی میں جگہ ملے گی اور کوٹھی میں سب ہوگا' گاڑی بھی..."

ایک لمحے کے لیے کرمو لاجواب ہوگیا "یہ فیکے نے کہا ہے؟ بکواس کرتا ہے وہ۔ اسے کیا معلوم۔"

"اسے سب معلوم ہے اور مجھے بھی...." عائشہ نے تن کے کہا "مگر مجھے پتا ہے تو کیوں اکیلا جانا چاہتا ہے۔ تو فلم والیوں کے ساتھ یاری لگائے گا اور دن رات رنگ رلیاں منائے گا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا۔"

اب کرمو نے اپنے بنیادی حق کا آزادانہ استعمال کیا "بھونکتی جارہی ہے کتیا کی طرح۔ جب میں نے کہہ دیا کہ نہیں تو بس نہیں۔"

عائشہ نے چیخ کے کہا "کیسے نہیں۔ میں بھی دیکھتی ہوں۔ میں اپنی اور تیری جان ایک کردوں گی مگر تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گی۔"

کرمو نے اس کے دوسرا جھانپڑ مارا "تیری اتنی ہمت۔ تو یہاں گھر میں رہے گی ابا کے ساتھ' بس۔"

کرمو کے سسر نے بھی کہا "ہاں پتر۔ بالکل رہے گی۔"

کرمو کے سالے نے سرہلایا "ایویں ضد نہ کر کڑیے۔"

"میں بھی بتارہی ہوں آخری بار" عائشہ نے چلاکے کہا "میں بیوی ہوں تیری۔ جہاں تو رہے گا وہاں میں رہوں گی۔"

غصے نے کرمو کو پاگل کردیا "ضد کرے گی تو بیوی بھی نہیں رہے گی۔ یہ سمجھ لے اچھی طرح۔ طلاق دے دوں گا...."

"تو بھی سمجھ لے کرمو" عائشہ دیوانوں کی طرح چیخ کے بولی "یہ جو کاکا ہے نا' تیری اولاد.... اسے چھری سے ذبح کردوں گی میں اور پھر اپنا گلا کاٹ کے کنوئیں میں گر جاؤں گی۔ دھمکی مت دے مجھے۔"

جب اس نے اچانک چھری نکال لی تو کرمو کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ عائشہ کے بھائی نے ایک دم حملہ کرکے اس سے چھری چھین لی "پاگل مت بن۔" اس نے بہن کو گلے لگالیا۔

عائشہ دھاڑیں مارمار کے رونے لگی "تم دیکھ لینا' میں یہی کروں گی۔ میں اسے پرائی عورتوں کے ساتھ عیش نہیں کرنے دوں گی۔ تم مجھے کیسے روک سکتے ہو' کب تک روک سکتے ہو۔"

اب کرمو نے اسے پیار سے سمجھانا شروع کیا۔ "دیکھو تھوڑے دن کی تو بات ہے۔ میں لاہور جاکے دیکھتا ہوں۔ کچھ پیسوں کا بندوبست ہوجائے پھر میں کوئی چھوٹا موٹا مکان لے لوں گا اور سب کو بلالوں گا۔ تجھے بھی اور ابا کو بھی۔"

عائشہ جیسے اسی موقع کے انتظار میں تھی۔ اس نے ایک دم قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا اور سارے نوٹ کرمو کی طرف اچھال دیے "یہ لے کتنے پیسے چاہئیں تجھے۔"

کرمو کا رنگ اڑ گیا۔ اس کے سسر کی نظر نوٹوں پر جم گئی۔ سالے کو سانپ سونگھ گیا۔

"مجھے نہیں چاہئیں گہنے۔ تو نے گہنے بنانے کے لیے دیے تھے مجھے پانچ ہزار۔ گن لے' یہ تجھے فلم والے دے گئے تھے نا۔"

کرمو نے نوٹ اٹھاکے گنے "یہ تو سات ہزار ہیں۔"

عائشہ کو اپنی جذباتی غلطی کا احساس ہوا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ غصے میں اس نے اپنے دو ہزار بھی پھینک دیے تھے "مجھے کیا معلوم کتنے ہیں۔ میں نے کون سے گنے تھے۔"

کرم داد کی عقل چکرا گئی "کیا اس نے غلطی سے دو ہزار زیادہ دے دیے تھے' گنے تو میں نے بھی نہیں تھے مگر.... یہ کارڈ کس کا ہے؟"

"میرے دوسرے خصم کا" عائشہ نے روتے ہوئے کہا "مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ سب وہی ہے جو تو نے دیا تھا۔"

کرمو کے ابا نے غصے میں اپنے سمدھی کو مخاطب کیا "دیکھا تم نے۔ یہ حرام کا جنا مجھ سے جھوٹ بول رہا تھا اور وہ جو اس کے ساتھ آیا تھا' اس نے بھی مجھ سے کہا کہ ابھی کوئی پیسہ نہیں دیا۔ پورے سات ہزار تھے جو اس نے مجھ سے چھپاکے اپنی بیوی کو دے دیے کہ گہنے بنوالے۔ اندھا ہوں نا میں اس لیے دھوکا دیا مجھے۔ پیدا میں نے کیا' پالا میں نے' شادی میں نے کی۔ آج بڈھے باپ کے لیے سات ہزار میں سے سات روپے بھی نہیں نکلے۔" وہ اپنی سفید داڑھی کو بے نور آنکھوں کے آنسوؤں سے بھگونے لگا۔

صدمے' غصے اور بے بسی کے جذبات نے کرم داد کو پاگل کردیا۔ وہ سات ہزار روپے سمیٹ کے اٹھا اور بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔ اسے وہاں سب اپنی خوشی کے دشمن نظر آرہے تھے۔ کسی

کو خوشی نہیں تھی کہ اسے تقدیر نے فلموں میں کام کرنے کا کتنا اچھا موقع فراہم کیا ہے۔ نہ جانے کب سے فلموں والے سید پور آرہے تھے۔ آج تک گاؤں کے کسی نوجوان کی طرف کسی نے نگاہ اٹھاکے نہیں دیکھا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے انجمن جیسی ہیروئن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور یہ بات ایک بہانہ بن گئی۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اسے شہرت ملے گی تو ان کو بھی ملے گی۔ وہ ہزاروں لاکھوں کمانے لگے گا تو وہ بھی عیش کریں گے۔ یہاں گاؤں میں ساری عمر چاچے دی ہٹی پر بیٹھ کے کیا ملے گا اسے؟ مگر سب اس کی راہ میں دیوار بن گئے ہیں۔ کوئی اسے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی مہلت دینا نہیں چاہتا۔ سب کی نظر میں صرف برائی ہے' حسد ہے اور بے صبری ہے۔

"سب سے بڑھ کر وہ سؤر کی بچی۔ میری گھر والی' ہزاروں روپے سب سے چھپاکے اس کے سامنے ڈال دیے تھے میں نے کہ لے دل کھول کے گہنے کپڑے بنا۔ وہ پھر بھی خوش نہیں۔ اسے بھی فکر ہے کہ میں اور کچھ نہیں کروں گا۔ بس دن رات فلم والیوں کے پیچھے پھرتا رہوں گا۔ مرد کو روک سکتا ہے کوئی اگر وہ برائی پر کمر باندھ لے۔ شراب یا ہیروئن پینے لگے۔ عورتوں کے چکر میں پڑجائے۔ اس میں کیا شہر اور کیا گاؤں۔ کیسے بھاگے سارے جو آئے تھے فرشتے بن کے مجھے سمجھانے۔"

وہ رات کے تاریک دامن میں خوابیدہ سید پور کے پہاڑوں سے اترا اور سیدھا چلتا گیا۔ وہ اندھیرے میں سایہ فگن میٹھے خوشبودار رس سے بھری خوبانیوں سے لدی شاخوں کے نیچے سے گزرا (قطعی آخری بار) زمین پر کالے فیتے کی طرح بچھی ہوئی سڑک پر اس کے قدم کسی اختیار کے بغیر آگے بڑھتے گئے۔ وہ کرم داد عرف کرمو نہیں تھا۔ سندباد تھا یا کولمبس تھا جو ایک نئی دنیا کی تلاش میں نئے سفر پر نکلا تھا۔ پرانی دنیا سے سب ناتے توڑ کے۔

○☆○

کرم داد کا ایک پورا دن اسٹوڈیو کے دروازے پر انتظار میں سوکھتے گزر گیا۔ گیٹ کیپر اسے کسی طرح بھی اندر جانے کی اجازت دینے پر راضی نہ تھا۔ اس کے نزدیک ہدایت کار اور معاون ہدایت کار کے کارڈ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایسے تو وہ اپنے کارڈ نہ جانے کس کس کو دیتے ہیں۔ ہاں کارڈ کے پیچھے وہ لکھ دیتے کہ کارڈ لانے والے کو اندر آنے کی اجازت دی جائے تو دوسری بات تھی۔

کرمو نے اسے پوری صورتِ حال سمجھائی۔ یہ بتایا کہ سید پور کہاں ہے اور وہاں اس نے انجمن کے ساتھ شوٹنگ میں حصہ لیا تھا۔ ہدایت کار نے اسے پورے پانچ ہزار ایڈوانس دیے تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ غلطی سے پانچ کے بجائے اسے سات ہزار دے دیے گئے تھے۔ اس نے معاون ہدایت کار کے اپنے گھر جانے کا تذکرہ بھی کیا مگر گیٹ کیپر کا دل نہ پسیجا۔ اس نے اکھڑ لہجے میں کہا "اچھا ابھی شور مت کرو۔ ادھر کھڑے ہو جاؤ۔ وہ آئے گا اور تم کو دیکھے گا' پھر اس سے بات کرنا۔"

کرم داد وہاں بہت سے دوسرے لوگوں کے ہجوم میں شامل آتے جاتے فلمی ستاروں کو اور فلم کی دنیا کے ان لوگوں کو دیکھتا رہا جن کے لیے ہر اسٹوڈیو کے دروازے خود بخود کھل جاتے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی شائقین کے اجتماع کی طرف نظر اٹھاکے بھی نہیں دیکھا۔ وہ ہر اسٹوڈیو کے گیٹ پر ایسے لوگوں کا مجمع دیکھنے کے عادی تھے جو سفارشی ہوتے تھے یا بزعم خود اداکارانہ صلاحیت کے فطری جوہر رکھتے تھے اور چانس دیا جاتا تو وہ ہر فلمی ہیرو ہیروئن یا ولن کی چھٹی کرا سکتے تھے۔ باقی محض تماشائی ہوتے تھے جو شوٹنگ دیکھنے آتے تھے یا کسی ہیروئن کی ایک جھلک۔

کرم داد کے لیے ایسے لوگوں میں شامل ہونا ایک مجبوری تھی اور وہ خود کو بہت بے عزت محسوس کررہا تھا۔ شام تک وہ کچھ کھائے پیے بغیر گیٹ سے گزرنے والوں کی صورتوں کو غور سے دیکھتا رہا کہ شاید ان میں سید پور آنے والے فلم یونٹ کا کوئی رکن شامل ہو جو اسے پہچان کے گاڑی روک لے اور اپنے ساتھ اندر لے جائے۔

چوکیدار نے رات کا اندھیرا پھیل جانے کے بعد کرم داد کی مستقل مزاجی کو درخورِ اعتنا سمجھا۔ شوقیہ فنکار اور تماشبین ہر روز کی طرح مایوس ہوکے واپس جاچکے تھے۔ صرف کرم داد تھا جسے چوکیدار نے نودس گھنٹے بھوکا پیاسا کھڑا دیکھا تھا اور یہ ہوسکتا تھا کہ وہ جھوٹ نہ بول رہا ہو۔

چوکیدار نے اسے قریب بلاکے کہا "اوئے خانہ خراب۔ ڈائریکٹر صاحب کا کچھ پتا نہیں۔ سارا رات شوٹنگ کرے۔ تم مرجائے گا ادھر صبح تک۔"

کرم داد نے کہا "اس کے بعد تو یقین آجائے گا تمہیں میری بات کا۔"

"اچھا۔ کارڈ کے پیچھے اپنا نام لکھو۔ ابھی کوئی اندر جائے گا تو ہم بھجوادے گا" چوکیدار نے افسوس سے سرہلایا "تم واقعی بے وقوف ہے۔ پہلی بار شہر آیا ہے۔"

"اب کیسے یقین آگیا تمہیں؟" کرم داد نے اس کے دیے ہوئے بال پین سے کارڈ کے پیچھے اپنا نام لکھا۔

"او یارا۔ ادھر سے ہم کتنا لوگ کو اندر چھوڑا؟ تم دیکھا..... ان میں سے کوئی ہمارے چاچے کا پتر نہیں تھا۔"

"پھر کیا بات تھی؟"

"بس وہ خوش کیا ہم کو۔ ابھی تم نیا جانور ہے۔ ہم بھی نیا تھا تو کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہم بتاتا ہے تم کو۔ یہ شہر ہے۔ یہاں ہر بند دروازہ ایک ہی چابی سے کھلتا ہے۔ سفارش کا چابی نہیں ہے تو قائداعظم نکالو۔"

"قائداعظم!" کرم داد نے حیرانی سے کہا۔

"سبز نوٹ والا قائداعظم۔ جیسا کام ایسا دام۔ اس کو نذرانہ

جرمانہ، رشوت کچھ بھی بولو۔ بات ایک ہی ہے۔ یہاں اس کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔ کچھ دن شہر میں رہے گا تو سمجھ جائے گا۔"

چوکیدار نے اندر جانے والے ایک شخص کے ہاتھ کرم داد کے نام والا کارڈ بھجوا دیا تھا۔ اس کا جواب کتنی دیر میں کون لاتا ہے، جواب آتا بھی ہے یا نہیں، یہ کرمو کی قسمت۔ انتظار کے درمیانی وقفے میں چوکیدار نے کرم داد کو رشوت کے فوائد، رشوت کی اقسام اور رشوت دینے کے پسندیدہ طریقوں کے بارے میں اپنے تجربات کی روشنی میں پرمغز لیکچر دیا۔

کرم داد کی جیب میں سات ہزار روپے تھے اور وہ صرف دس روپے خرچ کرتا تو ایک ٹانگ پر آٹھ گھنٹے بھوکا پیاسا کھڑا رہنے کے عذاب سے بچ سکتا تھا۔ یہ جان کے کرم داد کو اپنی بے وقوفی پر ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ کچھ دیر بعد جب اندر سے ایک ہرکارہ یہ پیغام لایا کہ مسٹر کرم داد کو فوراً اندر بھیج دیا جائے تو اس نے چوکیدار سے دوستانہ مصافحہ کیا اور اسے اندر لے جانے والی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے سبز کے بجائے سرخ نوٹ پیش کیا۔ یہ شہر میں زندگی گزارنے کے آداب اور ہنر سکھانے کے پہلے عملی سبق کا معاوضہ تھا۔

کرم داد کے لیے اگلے دو ہفتے بہت سخت تھے۔ اس نے جس ایکٹر کی جگہ لی تھی اس کا نام سیفو تھا۔ کرم داد کا فلمی نام بھی سیفو رکھا گیا۔ سیفو کی وہ پہلی فلم تھی چنانچہ فلمی دنیا میں اسے جاننے والوں کی تعداد محدود تھی۔ اسے کسی کی سفارش پر یہ رول دیا گیا تھا مگر اس نے ہدایت کار کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ اکثر دیر سے آتا تھا یا غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ سید پور میں وہ بغیر بتائے غائب ہو گیا تو ڈائریکٹر کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے فوری طور پر اس رول کے لیے کرمو کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ کرمو اس کی توقعات پر پورا اترا اور وہ شاٹ کسی پریشانی کے بغیر پورا ہو گیا۔

واپس لاہور پہنچ کے ڈائریکٹر کو عجلت میں کیے جانے والے اس فیصلے سے کچھ پریشانی ہوئی۔ اصل کردار کے ساتھ فلم کے کئی مناظر کی شوٹنگ کر لی گئی تھی اور اب اس کی جگہ نئے سیفو کو لیا جاتا تو اس کا مطلب تھا کہ پرانے سب شاٹس دوبارہ کیے جائیں۔

فلم کا ابھی ایک چوتھائی کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا اور سیفو کی وجہ سے تین بار شیڈول بدلنا پڑا تھا۔ اس سے پروڈیوسر کا بھی کئی لاکھ کا نقصان ہو گیا تھا۔ ہدایت کار کی تجربہ کار نظر مستقبل میں بھی سیفو کی وجہ سے ہونے والی گڑبڑ اور نقصانات کا اندازہ کر رہی تھی اور وہ سیفو کو کاسٹ سے خارج کرنے کے فیصلے سے خود بھی مطمئن تھا اور پروڈیوسر کو بھی مطمئن کر چکا تھا۔

"ایک چوتھائی سے بھی کم شوٹنگ ہوئی ہے ابھی۔ دو بار فلور کی بکنگ کینسل ہوئی۔ سینئر آرٹسٹوں کی تاریخوں کے شیڈول بدلنے پڑے اور اس کے لیے منت سماجت الگ کرنی پڑی۔ جرمانے کی رقم الگ گئی۔"

"جرمانہ کیسا؟" پروڈیوسر نے کہا۔

"اوجی دینا پڑتا ہے تھوڑا بہت زیادہ۔ جو ڈیٹس لے کر دیتے ہیں ان کی سیوا کرنی پڑتی ہے۔ آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا۔"

پروڈیوسر ایک بہت بڑا بیوروکریٹ تھا جس نے اپنا کالا دھن سفید کرنے کے لیے فلم میں پیسہ لگایا تھا اور فلمساز کے طور پر اپنے سالے کا نام دیا تھا "ڈائریکٹر صاحب، میرا تو دوالیا ہو جائے گا ایسے تو۔"

"اسی لیے میں نے ایک مصیبت سے جان چھڑائی ہے۔ یہ گاؤں کا لڑکا کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتا۔ دس بیس ہزار لے کے بھی خوش ہو جائے گا اور غلامی کرے گا۔ اس میں صلاحیت بھی ہے اور صورت شکل کا بھی اچھا ہے۔ گاؤں کا رہنے والا ہے اس لیے ڈیل ڈول بھی ماشاء اللہ ہے۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ پہلے آپ نے اسے ڈپلی کیٹ لیا تھا کام چلانے کے لیے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس کی صورت کافی حد تک سیفو سے ملتی ہے مگر اس کی ایکٹنگ دیکھ کے میں نے سوچا کہ اسے چانس دوں۔ یہ نیا چہرہ متعارف کرانے کا سہرا ہمارے سر رہے گا۔ آپ دیکھ لینا، ایک فلم کے بعد اس کی گڈی کیسے چڑھتی ہے۔"

"پھر وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

ڈائریکٹر ہنسا "یہ تو ہوتا ہے جی۔ ایک اچھی فلم کے بعد لائن لگ جاتی ہے کنٹریکٹ سائن کرانے والوں کی لیکن ابھی تو ہمارا سب نقصان بھی پورا ہو جائے گا اور سارا کریڈٹ بھی ہمیں ملے گا۔"

"مگر سیفو کا کیا ہو گا؟"

"اس کا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" ڈائریکٹر نے کہا۔

"گجرات کا ایک طاقتور ایم این اے ہے اس کے پیچھے۔ پورا خاندان سیاسی طور پر بہت طاقتور ہے۔" بیوروکریٹ نے پریشانی سے کہا "وہ کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔"

"آپ بھی سرکاری مشینری کے پرزے ہیں... اور کوئی معمولی حیثیت نہیں ہے آپ کی۔ آپ کیوں ڈرتے ہیں۔"

"ڈائریکٹر صاحب، ویسے تو جنگل کے قانون میں بھی ایک قانونِ فطرت چلتا ہے۔" بیوروکریٹ نے ٹھنڈی سانس لی "شیر مر جائے تو اسے دوسرا شیر نہیں کھاتا۔ سانپ کو سانپ شکار نہیں کرتا مگر ہمارے شہروں میں جنگل کا جو قانون نافذ ہے اس میں کوئی کسی سے محفوظ نہیں۔ نہ ایک سیاست داں کسی دوسری جماعت کے لیڈر سے۔ نہ ایک بیوروکریٹ دوسرے بیوروکریٹ سے۔ حد یہ ہے کہ ایک عالم دین کے ہاتھوں دوسرے عالم دین کی نہ پگڑی محفوظ ہے نہ جان و مال۔"

اسی وقت کسی نے وہ کارڈ لا کے دیا جو معاون ہدایت کار نے

عائشہ کو دیا تھا۔ اس کے پیچھے کرم داد نے اپنے نام کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ صبح سے گیٹ پر کھڑا ہے۔ ڈائریکٹر نے اسی وقت اپنے ڈرائیور کو گاڑی کے ساتھ بھیجا اور دس منٹ بعد کرم داد نے پروڈیوسر ڈائریکٹر کے شاندار آفس میں قدم رکھا۔

ڈائریکٹر نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "سوری بھئی، تمہیں اتنی پریشانی اٹھانی پڑی، بیٹھو۔"

کرمو پروڈیوسر سے ہاتھ ملا کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار کے رویئے کی شکایت کرنا اب لاحاصل تھا۔ "میں تو مایوس ہو گیا تھا سر کہ کہیں آپ سے ملے بغیر واپس نہ جانا پڑے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ہم خود کسی کو بھیج کر تمہیں سید پور سے بلواتے۔ آخر پانچ ہزار دیے تھے ہم نے تمہیں ایڈوانس۔"

"پانچ نہیں، سات سر!" کرمو نے کہا۔

ڈائریکٹر نے حیرانی سے کہا "مگر میں نے گن کر دیے تھے۔"

"آپ نے جلدی میں غلط گنے ہوں گے۔ میں نے بعد میں گنے تو وہ پورے سات ہزار تھے" کرمو نے کہا۔

پروڈیوسر کو اس سادہ لوح دیہاتی لڑکے کی ایمانداری نے ہی نہیں، شخصیت نے بھی متاثر کیا۔ اسے ڈائریکٹر کی یہ بات درست لگی کہ پہلی فلم ریلیز ہوتے ہی دوسرے فلمساز اس کو سائن کرنے پہنچ جائیں گے اور دیکھتے دیکھتے وہی ہوگا جو پہلے سے ہو رہا ہے۔ درجن بھر فلموں کا ہیرو بنتے ہی اس کا دماغ بھی آسمان پر پہنچ جائے گا اور ریٹ بھی۔

پروڈیوسر نے مطمئن ہو کے کہا "ٹھیک ہے جی۔ آپ پرانے شاٹ دوبارہ لیں اور اگر منٹ بھی کر لیں اس سے۔ جیسے مناسب سمجھیں۔"

ڈائریکٹر بھی اٹھ کھڑا ہوا "کل سے شروع ہوگا اس پر کام۔ میرا جو معاون ہدایت کار ساتھ تھا، وہ اسے سب سمجھائے گا۔ یہ تو ابھی کچھ نہیں جانتا۔"

کرمو نے کہا "سر جی۔ میرے پاس تو رہنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔"

ڈائریکٹر نے ایک لمحے کے لیے سوچا "چلو میرے ساتھ، ابھی کچھ دن تمہارا بندوبست کسی ہوٹل میں کر دیتے ہیں، ادھر لکشمی پر۔ وہاں سے آنے جانے میں بھی آسانی رہے گی۔"

ہوٹل کے شاندار کمرے میں کرم داد نے خود کو بے حد اہم اور خوش قسمت محسوس کیا۔ وہ ایک کامیاب مستقبل میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس کمرے کے نرم فوم والے بیڈ، قالین اور پردے، فریج، اے سی اور ٹی وی کو دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہوٹل کے سارے اخراجات بھی پروڈیوسر کے ذمے تھے۔ وہ کچھ بھی کھا سکتا تھا اور پی سکتا تھا۔

لیکن اس رات وہ سونے لیٹا تو اسے یوں لگا جیسے اس اجنبی ماحول میں ہر چیز اسے تمسخر اور حقارت سے دیکھ رہی ہے۔ تم کرمو ہو، ایک معذور، اندھے کمہار کی اولاد۔ سید پور جیسے پنڈ میں چاچے دی ہٹی پر بیٹھنے والے۔ تمہیں ڈوری کھینچ کے پردے کھولنا نہیں آتا۔ تم ٹی وی نہیں چلا سکتے، اے سی آن نہیں کر سکتے۔ بان کی جھلنگا چارپائی یا تخت پر سونے کی عادت ہے اس لیے فوم کے نرم بستر پر تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے۔

کرم داد بہت تھکا ہوا تھا مگر اس کو نیند نہ آنے کی وجہ صرف ماحول کی اجنبیت نہیں تھی۔ اس کا اصل آزار... احساس تنہائی تھا۔ لاکھوں انسانوں کی گہما گہمی سے گونجتے اس شہر، اس کی سیکڑوں سڑکوں کی لامحدود لمبائی پر دوڑنے والی شوخ رنگ اور چمکیلی ہزاروں گاڑیوں اور لاکھوں جگمگ کرتی روشنیوں کے درمیان وہ خود کو اتنا ہی اکیلا محسوس کر کے دکھی تھا جتنی سید پور کی سنسان رات میں ایک ویران کمرے کی اجاڑ چھت کو گھورنے والی عائشہ اکیلی ہوگی اور جتنا اپنی اندھیری دنیا میں کھانس کھانس کر رات بتانے والا بڈھا باپ اکیلا ہوگا۔ اس کے لیے یہ تصور کرنا محال تھا کہ سید پور بھی اسی زمین کے کسی ٹکڑے پر موجود ہے جس پر لاہور ہے یا کہیں ولایت بھی ہوگا اور یہی رات ہے جو بیک وقت ہر جگہ موجود اور مسلّط ہے۔

کمرے میں ایک ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا مگر اس کے لیے بے کار تھا۔ سید پور کے پہاڑوں میں آج بھی وقت لاہور سے سو سال پیچھے چل رہا تھا۔ وہاں ابھی بیسویں صدی بھی نہیں پہنچی تھی جبکہ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ سید پور میں بجلی نہیں تھی اس لیے ٹی وی اور وی سی آر نہیں تھے۔ ٹیلی فون کے کھمبے لگانے کی تجویز تک نہیں تھی۔ لوگ فریج اور اے سی کا مطلب نہیں سمجھتے تھے۔ گاڑی کا مطلب بیل گاڑی لیتے تھے۔ یہ نہیں کہ ان کو کچھ معلوم نہیں تھا یا انہوں نے یہ سب دیکھا نہیں تھا۔ مگر دیکھنے کو وہ چاند بھی دیکھتے تھے۔ پنڈی کا شہران سے صرف نو میل کی مسافت پر تھا مگر وہ سب جو شہر میں تھا ان سے اتنا ہی دور تھا جتنا چاند۔ وہ اس کی خواہش نہ کرنے کا شعور بہرحال رکھتے تھے۔

کیسا مزہ آتا اگر وہ یہاں سے فون گھماتا اور ادھر سے آشی ہیلو کہتی۔ وہ کہتا "آشی میں کرمو ہوں۔ لاہور کے ہوٹل سے بول رہا ہوں۔"

وہ کہتی "ہوٹل کب پہنچے۔ میں بہت دیر سے تمہارے فون کا انتظار کر رہی تھی۔"

"اچھا! اس کا مطلب ہے تم ناراض نہیں ہو مجھ سے؟"

"تم سے ناراض ہو کے زندہ رہ سکتی ہوں میں؟" وہ اداس لہجے میں کہتی۔

"اچھا یہ بتاؤ ابا کیسا ہے؟"

"ابا ٹھیک ہے۔ تمہیں یاد کر رہا تھا، رات کو کھانا کھاتے وقت۔"

"اور کاکا.... مجھے اس کی بہت یاد آ رہی ہے۔"

"وہ سو رہا ہے۔ میری یاد نہیں آئی تمہیں؟"
وہ ہنس کے کہتا "فون تمہیں اور کس لیے کیا ہے۔ خیر تم فکر مت کرو' انشاء اللہ چند دن میں سب کو بلوالوں گا میں۔"
وہ تصور میں آشی سے فون پر باتیں کرتے سوگیا تھا اور نیم خواب کی سی کیفیت میں بھی یہ گفتگو جاری تھی کہ فون کی گھنٹی چلانے لگی۔
وہ ہڑبڑا کے اٹھا اور اس نے ڈرتے ڈرتے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!"
دوسری طرف سے کسی نے غرا کے کہا "کون بول رہا ہے؟"
"میں.... کرم داد ہوں جی' آپ کون ہو؟"
"میں سیف الدین ہوں... سیفو' مجھے جانتے ہو نا؟"
کرم داد نے کہا "نہیں جی' میں تو آج ہی لاہور آیا ہوں سید پور سے۔"
سیف الدین ہنسا "تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ واپس سید پور لوٹ جاؤ۔ صبح ہوتے ہی بس کا ٹکٹ کٹالو۔"
"مگر کیوں جی' میں یہاں فلم میں کام کرنے آیا ہوں۔"
"دیکھو! تم ایک بے وقوف آدمی ہو۔ ان معاملات کو نہیں سمجھتے اس لیے میں تمہیں شرافت سے سمجھا رہا ہوں جو رول تمہیں دیا گیا ہے' وہ پہلے میں کر رہا تھا" سیف الدین نے کہا۔
"اچھا اچھا" کرم داد نے سمجھ کے سرہلایا "آپ آئے نہیں تھے اس لیے ڈائریکٹر صاحب نے مجھے رکھ لیا۔"
اس نے ڈائریکٹر کو ایک فحش گالی دی "اس سے تو میں نمٹ لوں گا۔ آخر وہ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ میرے ڈیڈی کے ایک فون پر فلم کا ہدایت کار بدل جائے گا۔ سب سے اچھا یہی ہے کہ تم خود یہ رول کرنے سے انکار کردو اور لوٹ جاؤ وہیں جہاں سے آئے ہو۔"
پس منظر سے کسی کی آواز نے کہا "جتھے دی کھوتی اتھے آن کھلوتی۔"
"دیکھو جی' اب تو میں نے فلم میں کام شروع کردیا ہے۔ اپنی مرضی سے نہیں' ڈائریکٹر کی مرضی سے" کرمو نے کہا۔
"یعنی تو شرافت سے نہیں مانے گا۔ اندھے کمہار کی اولاد' تو جانتا ہے میں کون ہوں؟"
"آپ نے ابھی اپنا نام بتایا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا میں۔"
"یہ جاننے کے چکر میں دیر کی تو مارا جائے گا....." اس نے گالی دے کر کہا۔
"بس جی پھر گالی مت دینا۔ ہمت ہے تو سامنے آکے بات کرو۔ کرمو کو گالی دینے والا کون ہے میں بھی تو دیکھوں؟" کرم داد کا چہرہ تپ گیا۔
"دیکھ لے گا بیٹے۔ بہت جلد.... میرا تیرا مقابلہ نہیں تھا کوئی اس لیے میں نے سوچا تھا کہ میں تجھے سمجھادوں گا شرافت سے۔ تو زندہ سلامت چلا جائے گا واپس لیکن اب لگتا ہے تیری لاش ہی جائے گی۔ دس بیس ہزار کی ضرورت ہے تو میں دے سکتا ہوں ایسے ہی۔"
کرم داد گرم ہوگیا "ایسے ہی کا کیا مطلب ہے اوئے؟ خیرات دینا چاہتا ہے مجھے؟ بہت حرام کا پیسہ ہے تیرے باپ کے پاس حرامی۔"
جواب میں غلیظ گالیوں اور دھمکیوں کا طوفان امڈ آیا۔
کرم داد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور پوٹھوہاری زبان کی ایسی گالیاں ارسال کرتا رہا جن کا مطلب بھی شاید دوسری طرف سے بات کرنے والے کی سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا اور غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔
لائن کٹ گئی تو کرم داد نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ اس کے وجود میں جیسے آگ سی بھر گئی تھی اور اس کا حلق خشک ہوگیا تھا۔ اس نے فریج کھول کے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور منہ لگا کے خالی کردی۔
شہر کی معاشرت میں دولت کی طاقت کے مظاہرے کا یہ دوسرا تلخ تجربہ تھا جس نے کرم داد کو اپنی بے وقعتی کا احساس دلایا تھا۔ پہلا تجربہ اسے سارا دن اسٹوڈیو کے گیٹ پر کھڑے رہ کر ہوا تھا۔ اس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا جب گیٹ کیپر نے اس سے قائداعظم کی بات کی تھی۔ یہ دوسرا جھٹکا اس پہلے جھٹکے سے کہیں زیادہ شدید تھا۔
کرم داد کے لیے اب نیند کا تصور بھی محال تھا۔ وہ کمرے کے بیچ میں کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کچھ کرنے کی ضرورت کا احساس شدت اختیار کرنے لگا تھا' کسی جانور کی طرح جس کی چھٹی حس اسے نامعلوم خطرے سے خبردار کردیتی ہے تو وہ اپنی جبلت کے مطابق دفاع کی حکمتِ عملی اختیار کرلیتا ہے۔
کچھ دیر سوچنے کے بعد کرم داد نے اس دھمکی کے بارے میں ڈائریکٹر کو بتانے کا فیصلہ کیا۔ وہ یقیناً کرم داد کو صحیح مشورہ دے سکتا تھا۔ اس نے کمرے کے ٹیلی فون سے ڈائریکٹر کے گھر کا فون نمبر ملانے کی کوشش کی تو اسے ناکامی ہوئی۔ جواب میں اس نے کوئی آواز نہیں سنی۔ دراصل ہوٹل سے باہر کا کوئی نمبر ملانے کے لیے پہلے ایک نمبر گھمانا پڑتا تھا اور اس کے بعد اصل نمبر ڈائل کیا جاسکتا تھا۔ کرم داد نے یہ سمجھا کہ ڈائریکٹر کے گھر کا فون بند ہے۔ رات کے ایک بجے وہ سو رہے ہوں گے۔
کرم داد کچھ خوف زدہ بھی ہو رہا تھا۔ سیف الدین عرف سیفو نے فون بند کرتے وقت یہ دھمکی دی تھی کہ ابھی ہوٹل آکے تیری لاش کا قیمہ نہ کیا تو میں بھی اپنے باپ کی اولاد نہیں۔ یہ بہت بڑی بات تھی اور کرم داد کا خیال تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ کسی کو ہوٹل میں گھسنے سے کون روک سکتا ہے۔ وہاں تو لوگ ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سیفو سیدھا کمرے میں گھس

آئے اور اسے قتل کردے۔
وہ کمرا بند کرکے سیڑھیوں سے نیچے گیا۔ ہال میں رات کے ایک بجے بھی لوگ بھرے ہوئے تھے اور کھانوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کاؤنٹر پر چلا گیا جہاں بیک وقت تین افراد ٹائی باندھے کھڑے تھے۔
"آپ میں سے ہوٹل کا مالک کون ہے جی؟" کرم داد نے کہا۔
وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے "کیوں، کیا بات ہے؟"
"مجھے کسی نے ٹیلی فون کرکے دھمکی دی ہے کہ وہ مجھے کمرے میں آکے قتل کردے گا" کرمو نے کہا "اگر میں نے فلم میں کام نہ چھوڑا۔"
ایک کلرک سیریس ہوگیا "آپ فلموں میں کام کرتے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟"
"یہ میں پولیس کو بتاؤں گا۔" کرم داد نے رعب سے کہا "ابھی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر سے بات نہیں ہوئی۔ ان کے فون بند تھے۔"
کلرک نے اسے اشارے سے ایک طرف بلالیا "پہلے مجھے بتائیں کہ دھمکی دینے والا کون ہے اور معاملہ کیا ہے؟ ممکن ہے کسی نے مذاق کیا ہو آپ کے ساتھ۔"
"بالکل نہیں۔ وہ مذاق نہیں کررہا تھا" کرم داد نے برہمی سے کہا "ابھی میں یہاں کسی کو بھی نہیں جانتا۔"
اس نے کرم داد کو تسلی دی "آپ پریشان نہ ہوں۔ ہوٹل میں کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا آپ کا۔ یہ شہر ہے کوئی جنگل نہیں پھر بھی آپ خطرہ محسوس کرتے ہیں تو ہم آپ کا کمرا بدل دیتے ہیں۔ رجسٹر میں اندراج تبدیل کیے بغیر۔ اگر کوئی آئے گا تو ہم سے پوچھے گا۔ ہم پہلے آپ کو بتائیں گے... اور جس نے دھمکی دی تھی وہ سیدھا پرانے کمرے میں جائے گا۔ میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔"
کرم داد کو یہ ترکیب پسند آئی۔ کچھ دیر بعد اس کے لیے سیکنڈ فلور پر دوسرا کمرا کھول دیا گیا اور کرم داد کے کہے بغیر رجسٹر میں لکھ دیا گیا کہ مسٹر کرم داد نے ہوٹل چھوڑ دیا ہے۔
دوسرا کمرا بالکل مختلف پوزیشن میں تھا لیکن اندر سے آسائش کے اسباب وہی تھے۔ کرم داد پریشانی کے عالم میں کچھ دیر بیڈ پر بیٹھا رہا۔ سونے کی کوشش کرنا ابھی لاحاصل تھا لیکن اس نے لائٹ بجھادی اور لیٹ گیا۔ یہ صورتِ حال اس کے لیے انتہائی غیر متوقع تھی اور اب وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ فلم کے ہدایت کار کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ فون کرنے والا کوئی بہت بڑا بدمعاش تھا یا اتنا اثر رسوخ رکھتا تھا کہ فلمساز سے کہہ کے ہدایت کار کو تبدیل کراسکتا تھا۔ اگر اس نے ڈائریکٹر ہی بدل دیا تو سید پور سے تشریف لانے والے کرم داد کا کیا ہوگا؟ ابھی اس کا ایک ہی شاٹ لیا گیا ہے۔ کیا وہ سین نکال دیا جائے گا اور اسے رخصت کردیا جائے گا کہ معاف کرو بابا، کسی اور دروازے پر جا کے قسمت آزماؤ۔ وہ کہاں جائے گا؟ ایسے دھکے کھانے منظور ہوتے تو وہ اس چانس پر انحصار کیوں کرتا؟ بہت پہلے سے لاہور کے اسٹوڈیوز کی خاک چھان رہا ہوتا۔
رات کے کسی پہر میں اس کی آنکھ لگی تو وہ دن چڑھے تک سوتا رہا۔ گاؤں میں وہ کھلی جگہ پر سوتا تھا تو صبح کا اجالا اس کی پلکوں پر سورج کے طلوع ہونے سے بہت پہلے اتر آتا تھا اور اسے بیدار کردیتا تھا۔ آس پاس پرندے ہر درخت پر چہچہانے لگتے تھے اور ذرا دیر ہوجائے تو ابا اندازے سے بالکل صحیح سمت میں اپنی جوتی کا میزائل چلا کے چلاتا تھا "اٹھ جا منحوس، دیکھ چرند پرند سب رب کی ثنا کررہے ہیں اور تو پڑا ہے مردے کی طرح۔"
ہوٹل میں خاموشی تھی اور کھڑکی پر پڑے ہوئے پردوں کی وجہ سے صبح کا اجالا باہر ہی رک گیا تھا۔ کرم داد کی آواز ہلکی سی دستک پر کھلی۔ اس نے اٹھتے ہی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو دس بج رہے تھے۔ "کون ہے؟" اس نے پوچھا۔
"میں ہوں سر! ہوٹل کا منیجر۔"
کرم داد نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے سوٹ میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا مسکرا رہا تھا "آئی ایم سوری! میں نے آپ کو نیند میں ڈسٹرب کیا۔"
"نہیں۔ آپ نے اچھا کیا۔ بہت دیر ہوگئی تھی مجھے" کرم داد نے کہا۔
"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"
"ہوٹل آپ کا ہے جی۔ آپ کو روک سکتا ہوں میں، ضرور آئیں۔"
"تھینکس۔" اس نے اندر آکے کہا اور دروازہ بند کردیا "میں رات والے واقعے پر آپ سے بات کرنے آیا تھا۔ مجھے کلرک نے صبح بتایا۔"
"بعد میں کوئی مجھے قتل کرنے تو نہیں آیا تھا؟" کرم داد بولا۔
منیجر مسکرانے لگا "نیت کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے لیکن دو ملاقاتی آئے تھے آپ کے۔"
کرم داد چونکا "کیا نام تھے ان کے؟"
"اب آپ جانے دیں۔ بات بڑھانے سے ہماری بدنامی ہوگی۔ وہ بھی معزز لوگ تھے۔ آپ کا تعلق بھی فلموں سے ہے۔ نہ ہم آپ جیسے فنکاروں کو ناراض کرسکتے ہیں اور نہ ان سے دشمنی مول لے سکتے ہیں۔ ہمارا تو بزنس متاثر ہوتا ہے۔ میں آپ سے یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ آپ کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کریں۔ خصوصاً اخبار والوں سے۔"
"لیکن میں فلم ساز اور ہدایت کار کو ضرور بتاؤں گا۔"
"آپ غسل فرمالیں پھر ناشتا آجائے گا۔ چونکہ ہم نے مہمانوں کے رجسٹر میں لکھ دیا ہے کہ آپ تشریف لے جاچکے ہیں

اس لیے قانونی طور پر مجبوری ہے...“

کرم داد سمجھ گیا ”ٹھیک ہے۔ میں خود یہاں رہنا نہیں چاہتا۔“

”پلیز ڈونٹ مائنڈ اِٹ سر۔ آپ کے ذمے کچھ نہیں۔ آپ ہمارے مہمان تھے“ اس نے کرم داد سے ہاتھ ملایا اور نکل گیا۔

کرم داد نے ناشتے کے بعد یہی بہتر سمجھا کہ وہ سیدھا اسٹوڈیو چلا جائے۔ وہاں سے وہ ڈائریکٹر یا معاون ہدایت کار اور فلمساز سب کو فون کرکے اپنی پریشانی سے آگاہ کرسکتا تھا۔

وہ باہر نکلا ہی تھا کہ دروازے کے قریب کھڑی ہوئی ایک شاندار گاڑی کا ڈرائیور اس کی طرف بڑھا ”کرم داد صاحب! ادھر آیئے میرے ساتھ۔ ڈائریکٹر صاحب نے گاڑی بھیجی ہے آپ کو اسٹوڈیو لے جانے کے لیے۔“

گاڑی میں اور کوئی نہیں تھا۔ ڈرائیور نے اس کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ کرم داد کے بیٹھتے ہی دائیں بائیں سے دو افراد بڑی تیزی سے آکے اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”تم.... کون ہو تم لوگ....“ کرم داد نے خود کو محصور اور ان دونوں کے خطرناک تیور دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم باپ ہیں تمہارے“ ایک نے کہا ”چپ کرکے بیٹھو۔“

کرم داد نے خود کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے کی لاحاصل کوشش کی ”کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے‘ چھوڑو مجھے.... ورنہ میں شور مچاتا ہوں۔“

”مچا شور....“ ان میں سے ایک نے ریوالور نکال کے کرم داد کی پسلیوں سے لگا دیا ”حلق سے آواز نکلی پتر تو اس میں سے گولی نکلے گی اور پیچھے سے پھونک نکل جائے گی تیری.....“

دوسرے نے کہا ”لاش پڑی رہ جائے گی سڑک پر۔“

کرم داد کا سارا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہوگیا اور اسے یوں لگا جیسے اس کا پیشاب خطا ہوجائے گا۔ اس کے پیٹ میں بھی مروڑ سے اٹھنے لگے تھے۔ موت کو اس نے اتنے قریب سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے ہکلا کے بولا ”میں.... میں نے..... میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“

”رات کو بڑا اونچا بول رہا تھا فون پر۔“ ایک نے اس کے سینے پر کہنی ماری۔ کرم داد کا سانس رکنے لگا۔

دوسرے نے ریوالور کو پوری قوت سے پسلیوں میں دبا دیا ”جو کہنا ہے چوہدری صاحب سے کہنا۔“

آدھے گھنٹے بعد اسے ایک بہت بڑے پھاٹک والی حویلی کے شاہانہ ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں اصلی سیفو بڑی شان سے صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کرم داد سے ہاتھ ملایا ”بیٹھو یار‘ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس طرح بلوانا پڑا۔ رات کو تھوڑی سی گرما گرمی ہوگئی تھی ہماری۔ اس وقت میرا دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔ نشے میں معلوم نہیں کیا کہا تم سے....“

کرم داد نے ایک گہری سانس لی ”آپ مجھ سے ملنے ہوٹل بھی آئے تھے۔“

”میں...؟ نہیں...“ وہ بولا ”لیکن میں نے اپنے دو خاص بندے ضرور بھیجے تھے‘ تمہیں سمجھانے کے لیے۔“

”سمجھانے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“

اس نے کرم داد کے سوال کو نظرانداز کردیا ”یہ مسئلہ بن گیا ہے میری عزت کا۔ ایک معمولی ڈائریکٹر مجھے کاسٹ سے خارج کردے‘ یہ نہیں ہوسکتا۔ سب لوگ ہنسیں گے مجھ پر۔“

”لیکن جناب...!“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ ڈائریکٹر کے ساتھ آج بات ہوجائے گی۔ فلمساز کو میرے چاچا کا ایک فون کافی ہوگا۔ اگر اس نے مجھے نہ رکھا تو ڈائریکٹر دوسرا آجائے گا۔“

”چوہدری صاحب! آپ بڑے آدمی ہو‘ خدا نے آپ کو دولت عزت سب کچھ دی ہے۔ میرے لیے یہ مستقبل کا سوال ہے... اور کون چانس دے گا مجھے۔ یہ تو اتفاق سے...“

میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون بجنے لگا تو کرم داد خاموش ہوگیا۔ سیفو نے ریسیور اٹھا کے کہا ”ہیلو... کون....؟“ اس کے ساتھ ہی سیفو کی نظر کرم داد پر جم گئی اور اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ کچھ دیر وہ سنتا رہا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور انگلیاں چٹخاتا رہا پھر اس نے کہا ”اوئے‘ بہت ہوگئی بکواس۔ اپنی اوقات مت بھولو ورنہ اس کے ساتھ تمہیں بھی کتے کی موت مار دوں گا“ اس نے دھڑ سے ریسیور رکھا اور چلانے لگا۔

کرم داد کو اغوا کرکے لانے والے فوراً اندر آگئے۔

”اوئے تم بتاؤ پہلے“ وہ کرم داد سے مخاطب ہوا ”کس کو بتایا تھا تم نے میرے بارے میں‘ یہاں آنے سے پہلے۔“

”رات کو بات کی تھی میں نے جناب۔ ہوٹل کے کلرک سے۔ اس نے میرا کمرا بدل دیا تھا۔ صبح منیجر کے کہنے پر چھوڑ دیا“

کرم داد کا حلق خشک ہوگیا۔

”ہوٹل سے کوئی گاڑی تمہارے پیچھے لگی تھی؟“ سیفو نے دونوں ملازموں سے سوال کیا ”کوئی اس کے ساتھ باہر آیا تھا؟“

انہوں نے ایک ساتھ نفی میں سرہلایا ”ہم نے تو نہیں دیکھا جی۔“

”پھر کسی کو کیسے معلوم ہوا.... کہ یہ اس وقت یہاں ہے؟“ سیفو نے غصے میں دھاڑ کے کہا ”اس نے فون کیا اور مجھے دھمکی دی کہ کرم داد ہمارا بندہ ہے۔ اسے کچھ ہوا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ کون ہوسکتا ہے وہ؟“

کرم داد کی حالت پھر غیر ہوگئی ”میں کیا بتاؤں جناب!“

”کس کے بندے ہو آخر تم؟“

”میں تو جی..... بس خدا کا بندہ ہوں سب کی طرح۔“

سیفو سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا "جھوٹ مت بولو۔ یہاں کس کو جانتے ہو تم؟"

"میں کل آیا ہوں پہلی بار لاہور جناب! فلم کے جو لوگ سید پور آئے تھے' ان کے سوا میرا کوئی واقف نہیں۔"

وہ صوفے پر کرم داد کے ساتھ بیٹھ گیا "دیکھو کرم داد۔ کچھ لوگ اس معاملے کو خوا مخواہ الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے جتنے دوست ہیں اس سے زیادہ دشمن ہیں۔ وہ اس سچویشن کو EXPLOIT کر رہے ہیں۔"

"کیا کر رہے ہیں جی!"

"فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تمہیں استعمال کرنا چاہتے ہیں تاکہ میری جگ ہنسائی ہو۔ ممکن ہے وہ تم سے کہیں کہ میرے خلاف اخبار والوں کو بیان دو۔ پولیس میں رپورٹ لکھوا دو... کہ میں نے تمہیں دھمکیاں دی تھیں۔ وہ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تم سے کہیں گے کہ ڈٹے رہو۔ سیف الدین تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ فلم میں اس کی جگہ تمہیں ہی رول کرنا ہے لیکن تم اس سیاست میں مت پڑو۔ گاؤں میں تمہارے بیوی بچے ہیں' اندھا باپ ہے۔ تمہارے بعد ان کا خیال کون رکھے گا۔ تم واپس چلے جاؤ۔ تم کو جتنے پیسے کی ضرورت ہو مجھ سے لے لو اور اگر تمہیں فلموں میں کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں' میں دوسری فلم میں چانس دلا دوں گا تمہیں لیکن اس فلم میں مجھے نکال کے تمہیں رکھ لیا جائے' اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"مجھے یہ سب معلوم ہوتا تو میں ادھر کا رخ بھی نہ کرتا جی۔"

کرم داد واقعی ڈر گیا تھا مگر وہ فوراً کوئی وعدہ بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔ اس کے لیے بھی ناکام واپس لوٹنا اپنا مذاق اڑوانے والی بات تھی۔ وہ سب کی مخالفت مول لے کر اور مخالفوں کو بے عزت کر کے لاہور آیا تھا۔

"خیر' اب بھی کچھ نہیں گیا" سیفو نے کہا "تم جا کے ڈائریکٹر سے کہہ دو کہ تم یہ رول کرنا نہیں چاہتے۔ وہ اسی فلم میں تم کو دوسرا رول بھی دے سکتا ہے اور نہ دے تو میرے پاس آ جانا تم۔ میرا بھی ارادہ ہے اپنی فلم بنانے کا۔ اس میں تمہارا چانس پکا۔ تب تک تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ ہماری دو فیکٹریاں گجرات میں ہیں ایک گوجرانوالہ میں' ایک لاہور میں۔"

"مگر مجھے تو کوئی کام نہیں آتا جناب!"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے کرم داد کے کندھے پر تھپکی دی "میرا چاچا تمہیں کہیں بھی رکھوا سکتا ہے۔ تم چاہو تو اپنے گھر والوں کو بھی بلا لو۔"

"ٹھیک ہے جناب!" کرم داد نے بات کو مختصر کیا "میں سوچوں گا۔"

"سوچوں گا؟ سوچنے والی کون سی بات ہے اس میں۔ بس تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔" سیفو نے سخت لہجے میں کہا "ورنہ...."

کرم داد نے کہا "اپنے ڈرائیور سے کہیں مجھے فلم اسٹوڈیو چھوڑ دے۔"

وہ اب اپنی جان چھڑا کے یہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ ایک نامعلوم شخص کی ٹیلی فون کال پر سیفو کی پریشانی نے کرم داد کو تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے تھوڑی سی خوشی بھی ہوئی تھی اور کسی انجان شخص کی طرف سے حاصل ہونے والی محافظت کی پیشکش نے اس کے خوف کو کچھ کم کر دیا تھا۔ کسی نے اسے اپنا خاص بندہ قرار دیا تھا۔ اس نے سیفو کی دشمنی میں ایسا کیا تھا تب بھی وہ ایک بار اس سے ملنا ضرور چاہتا تھا۔ یہ احساس کرم داد کے لیے خاصا باعثِ تقویت ہو رہا تھا کہ وہ بالکل لاوارث اور تنہا نہیں ہے۔ اس کی پشت پر بھی کسی کا ہاتھ ہے اور وہ خود بھی کرم داد سے رابطہ ضرور کرے گا۔

وہ سیفو کی گاڑی سے اسٹوڈیو کے گیٹ پر اترا اور اندر چلا گیا۔ فلمساز اور ہدایت کار کے مشترکہ آفس میں اس وقت صرف معاون ہدایت کار موجود تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے کرم داد سے مصافحہ کیا۔

"مجھے پتا چلا تھا کہ تم پہنچ گئے ہو۔ اکیلے آئے ہو؟"

کرم داد نے سر ہلایا "ابھی تو اکیلا ہی ہوں۔"

وہ کچھ مایوس نظر آنے لگا "اب تمہیں بیوی بچوں کو بھی بلا لینا چاہیے کیونکہ یہاں تمہارا کام شروع ہو گیا تو تمہیں فرصت نہیں ملے گی سر کھجانے کی۔ تم ایک کے بعد ایک فلم سائن کرتے جاؤ گے' لکھوا لو مجھ سے۔"

"ابھی میرے رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔"

"بھئی کچھ دن ہوٹل میں عیش کرو پھر ہو جائے گا رہائش کا بندوبست بھی" وہ بولا۔

"آپ ہوٹل کی بات کرتے ہو۔ اگلے مجھے لاہور میں رہنے نہیں دینا چاہتے۔ کہتے ہیں بس میں بیٹھ کے واپس چلے جاؤ ورنہ چار بندے اٹھا کے کہیں گاڑ آئیں گے" کرم داد بولا۔

معاون ہدایت کار نے اسے غور سے دیکھا "کسی نے دھمکی دی ہے تمہیں؟"

کرم داد نے سر ہلایا اور اسے ساری بات بتا دی۔ "کون ہے یہ سیفو؟ میرا مطلب ہے اتنی بدمعاشی کیوں دکھاتا ہے؟ کیا ہے آخر اس کا چاچا؟"

معاون ہدایت کار متفکر نظر آنے لگا تھا "ویسے تو کچھ بھی نہیں۔ معمولی ایس پی ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تھانے دار کا بھی باپ۔ پولیس کا بہت بڑا افسر۔ اس کے اپنے اختیارات کم نہیں ہوتے۔ اس سے تو ہم نمٹ لیتے۔ ہمارے بھی تعلقات ہیں ڈی آئی جی اور آئی جی سے۔ جو اس کے بھی افسر

ہیں لیکن اصل مشکل یہ ہے کہ سیفو کا باپ..... اسمبلی کا رکن ہے اور ایک ماموں سینیٹر ہے۔ وہ حکومت میں ہیں' ان کا بہت اثر رسوخ ہے۔"

"اچھا جی' پھر میں کیا کروں؟" کرم داد نے کہا۔

"ابھی دیکھو' ڈائریکٹر صاحب اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے لیکن فلمساز چاہے تو لوگوں کو بیچ میں ڈال کے معاملے کو سلجھا سکتا ہے لیکن سوال وہی ہے کہ اسے کیا ضرورت ہے کسی الجھن میں پڑنے کی' صرف تمہاری خاطر..."

کرم داد مایوس ہوگیا "اس کا مطلب ہے ڈائریکٹر صاحب بھی کچھ نہیں کریں گے۔"

"وہ تو زیادہ بے بس ہیں۔ فلمساز جب چاہے ہدایت کاری کے لیے کسی اور کی خدمات حاصل کر سکتا ہے۔"

"یہ تو کوئی اصول اور انصاف کی بات نہ ہوئی جی!"

معاون ہدایت کار ہنسنے لگا "یہ بزنس کی بات ہے' کاروبار کی اور کاروباری آدمی صرف نفع نقصان کو دیکھتا ہے مگر اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ فلم نہ سہی' کوئی اور سہی۔ یہاں تو ہر روز مہورت ہوتا ہے ایک فلم کا۔"

"کیا ہوتا ہے؟"

"مہورت۔ افتتاح" معاون ہدایت کار نے کہا "تمہیں بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ تمہارا بزنس ہے۔ بزنس میں جذبات کا کیا دخل۔ تم اگر تھوڑی سی عقل سے کام لو تو کامیاب اور خوش حال مستقبل کے سارے دروازے کھل سکتے ہیں تم پر۔"

"وہ کیسے جی.....؟ میں تو وہی کرتا ہوں جو آپ کہتے ہو۔"

"نہیں۔ تم عزت' غیرت اور شان کے فضول چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ تم اگر فلم میں کام کرو تو یہ عزت کی بات ہے۔ گھر والی کرے تو بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ تمہاری غیرت جاگ اٹھتی ہے۔ یہ تمہاری شان کے خلاف ہے۔"

"آدمی ایسا نہ سمجھے اور صرف پیسہ کمانا چاہے تو بیوی کو سیدھا کوٹھے پر بٹھادے" کرم داد نے تلخی سے کہا۔

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ فلم میں کام کرنا کوئی جسم فروشی نہیں ہے۔ یہ اسٹوڈیو ہے' شاہی محلے کا کوٹھا نہیں۔ یہاں میں بھی کام کرتا ہوں۔ میرے جیسے سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ مختلف کام کرتے ہیں۔ لائٹ مین' کیمرا مین' ایڈیٹر' کہانی لکھنے والے' سنگر' نغمہ نگار' لیبارٹری کے لوگ۔ فلم کے ایک نہیں سیکڑوں شعبے ہیں۔ ڈسٹری بیوٹر سے سنیما کے مالک تک سب ایک ہی انڈسٹری ہے۔ اس میں سب کی طرح فلم اسٹار بھی اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو آپ جی' لیکن ہمارے گھر کی عورتیں سرخی پوڈر لگا کے کیمرے کے سامنے ناچیں گائیں' غیر مردوں سے محبت کی باتیں کریں اور غیر مرد ان کے بدن کو ہاتھ لگائیں' انہیں اپنے ساتھ چمٹائیں' یہ ہم برداشت نہیں کرسکتے۔ ہماری عورتیں کب برداشت کر سکتی ہیں۔"

"بات صرف یہ ہے کہ تم نے ان پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ ان کے لیے شرم وحیا کے معیار خود مقرر کر رکھے ہیں۔ کسی عورت کو آزادی دے کر دیکھو۔ یہ جو معاشرتی بندھن تم نے ڈال رکھے ہیں انہیں اسیر رکھنے کے لیے' اخلاقی قدروں کے..."

کرم داد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا "پتا نہیں جی آپ کیا کہہ رہے ہو۔ آخر یہ شہر والے اپنی بہو بیٹیوں کو فلموں میں کیوں نہیں لاتے۔ اگر ایسا ہی ہے تو.... آپ کے خاندان میں بھی لڑکیاں ہوں گی۔"

معاون ہدایت کار نے ضبط سے کام لیا "بالکل ہیں مگر ان میں وہ صلاحیت نہیں ہے۔"

اسی وقت فلمساز اور ہدایت کار آگئے۔ کرم داد نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ معاون ہدایت کار سے اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کس صلاحیت کی بات کر رہا تھا؟ یہ کرم داد سمجھ چکا تھا مگر اس کی ایک بات اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گئی تھی۔ تم ذرا آزادی دے کر دیکھو کسی عورت کو۔ کیا واقعی یہ آزادی کا مسئلہ ہے؟ اگر عائشہ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بھی فلموں میں عزت' شہرت اور دولت کمانے کی خواہش سے اتنی ہی مغلوب ہوگی جتنا وہ خود ہے؟

کرم داد کی روداد سن کے ہدایت کار کا چہرہ اتر گیا "اچھا! بات اتنی بڑھ جائے گی' مجھے معلوم نہیں تھا۔"

فلمساز نے بلا تذبذب فیصلہ سنا دیا "او یار' اب اتنی سی بات پر ہم جھگڑا تو مول نہیں لے سکتے۔"

"پھر اس دوسرے بندے سے جھگڑا ہوگا۔"

"وہ خوامخواہ کی بات ہے۔ ایک کردار ہم نے سیفو کو دیا تھا۔ اس میں دوسرے بندے کو صرف ایک شاٹ میں ٹرائی کر لیا۔ سیفو اپنی جگہ ہے۔ کوئی زبردستی تو رول نہیں دلوا سکتا کسی کو فلم میں۔ وہ بھی کسی کو کاسٹ سے نکلوا کے۔"

کرم داد کا دل ڈوبنے لگا "سر جی پھر میرا کیا بنے گا؟"

"بھئی یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ یہاں ایسے سیکڑوں ہیں جن کو فلم میں کوئی چانس ملتا ہے مگر وہ کچھ نہیں بنتے" فلمساز نے کہا۔

ہدایت کار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی "لیڈنگ رول ملا جی۔ ہیرو آئے فلموں میں مگر فلم فلاپ ہوگئی تو سب ختم۔ آج کوئی نام بھی نہیں جانتا ان کا کہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے؟"

انٹرکام کا بزر بجا تو فلمساز نے ریسیور اٹھالیا "کیا بات ہے؟"

"سر' رانا شوکت علی آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں" سیکریٹری نے کہا "میرے پاس بیٹھے ہیں۔"

"کمال کرتی ہو تم بھی۔ اندر لے آؤ انہیں فوراً۔ وہ کوئی عام

آدمی ہیں کہ تم نے میٹنگ کے بہانے روک لیا" فلمساز نے ناراضی سے کہا۔

ہدایت کار نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "رانا صاحب کی تشریف آوری بے مقصد نہیں ہوسکتی۔"

فلمساز نے تائید میں سرہلایا "مقصد بھی پتا چل جائے گا۔"

رانا چھ فٹ قد کا صحت منداور وجیہہ شخص تھا۔ اس کے کلین شیو تروتازہ چہرے پر قیمتی سنہرے فریم کی عینک بہت بھلی لگتی تھی۔ وہ خاندانی جاگیرداروں کے روایتی شلوار قمیص اور کلف تنے شملے والی دستار کے بجائے بہترین سوٹ میں تھا۔ یہ فیوڈل لارڈز کی نئی نسل تھی جس نے ولایت یعنی لندن، امریکا اور سوئزرلینڈ میں رہ کے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور پھر وطن واپس آکے جدّی پشتی سیاست، زراعت، صنعت کی موروثی سلطنت کا انتظام سنبھال لیا تھا۔

رانا نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ سب سے پرجوش انداز میں ہاتھ ملایا۔ رسمی تکلفات سے فارغ ہوتے ہی اس نے کہا "بھئی پہلے ٹھنڈا پانی، بہت گرمی ہے اس ملک میں تو پھر کافی..." اس نے امپورٹیڈ سگریٹ کا پیکٹ نکال کے سب کے سامنے کیا اور پھر اپنی سگریٹ جلالی۔

ہدایت کار اور فلمساز اگر اس سے آمد کا مقصد پوچھتے تو یہ بداخلاقی سمجھی جاتی۔ رانا ان لوگوں میں تھا جو کہیں جاتے ہیں تو گویا دوسرے پر احسان کرتے ہیں۔ جسے شرفِ ملاقات بخشتے ہیں اس کے لیے یہ اعزاز کی بات ہونی چاہیے۔ وہ اسمبلی کا رکن تھا اور اس نے مرکزی اسمبلی کی سیٹ چھوڑ کے صوبائی نشست اپنے پاس رکھی تھی جہاں اس کے ساتھ ایک مضبوط گروپ تھا۔ سیاسی پنڈت اشاروں میں یہ واضح کرنے لگے تھے کہ حالات کی موافقت کا یہ سلسلہ جاری رہا تو صوبائی سیاست میں .......... رانا ایک مضبوط ترین امیدوار بن کے ابھر سکتا ہے۔

رانا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ فلمی صنعت کا کیا حال ہے۔ کیا مسائل ہیں؟ پھر وہ مطلب کی بات پر آگیا "کون سی فلم ہے جی آج کل آپ کے ہاتھ میں؟ بڑا ڈنکا بج رہا ہے آپ کی ہدایت کاری کا۔ میں نے بھی دیکھی ہیں ایک دو فلمیں ابھی۔"

فلمساز نے کہا "خیر ہو رانا صاحب۔ کیا ادھر بھی کچھ خیال ہے آنے کا؟"

رانا نے ایک کش لیا "کچھ پکا نہیں ہے ابھی۔ سوچا ضرور ہے۔ لوگوں سے سنا یہاں کہ فلمیں اچھی نہیں بن رہی ہیں تو بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بھئی کس چیز کی کمی ہے اپنے پاکستان میں۔ خیر سے اچھے ہدایت کار ہیں آپ جیسے۔ اچھے اسٹوری رائٹر ہیں۔ اچھے ایکٹر ہیں۔ ناردرن ایریا کا جواب نہیں آؤٹ ڈور لوکیشن کے لیے پھر مسئلہ کیا ہے؟"

فلمساز نے کہا "مسئلہ ہے سرمائے کا رانا صاحب۔ بڑے سرمائے کا۔ جتنے سرمائے سے ہم پوری فلم بناتے ہیں، اتنا ہمارے پڑوسی ملک کے ہیرو کا معاوضہ ہے۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے" رانا نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا "سب یہی کہتے ہیں۔"

ڈائریکٹر نے کہا "کچھ فنی سہولتوں کا فقدان ہے۔"

"وہ بھی سرمائے کا مسئلہ ہی ہوا نا۔ ہر چیز مل رہی ہے دنیا کے بازار میں۔ خرید بھی سکتے ہو آپ اور کرائے پر بھی لے سکتے ہو۔ یہ سوچ کے میں نے کہا کہ ایک فلم تو بنا کے دیکھنا چاہیے۔ ٹیم کا کپتان ہوتا ہے ہدایت کار۔ تو سب سے پہلے آپ کے پاس آگئے، اب باقی ٹیم آپ بناؤ۔"

ہدایت کار نے بے چینی سے پہلو بدلا "دیکھئے رانا صاحب! آپ کی جو رائے ہے میرے بارے میں.... وہ بڑی عزت کی بات ہے لیکن ابھی ایک فلم ہے میرے ہاتھ میں..."

فلمساز نے کہا "میں نے اپنی فلم شروع کی ہے۔"

"شروع کی ہے؟" رانا نے سوچ کے کہا "یعنی ابھی بہت ٹائم لگے گا اس کو مکمل ہونے میں۔ ایک ساتھ دو فلمیں نہیں کرتے آپ؟"

"وہ... بڑا مشکل ہوجاتا ہے ملک صاحب.... دو خصم کرنے والی بات ہوجاتی ہے" ہدایت کار نے دل ہی دل میں رانا کو احمق نمبرون قرار دیا جو یہ بات کرنے یہاں آگیا۔ وہ ہدایت کار کو اپنے گھر یا آفس میں بلا کے بھی بات کرسکتا تھا۔

"یار، اتنا وقت تو نہیں ہے میرے پاس" رانا نے سوچ کے کہا "آپ کو کتنا عرصہ ہوا فلم شروع کیے۔ ذرا مجھے بتاؤ۔ موضوع کیا ہے..... گھبراؤ نہیں۔ رانا پر بھروسا کرسکتے ہو تم۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

فلمساز مشکل میں پڑگیا "وہ..... دراصل.... فلم میں نہیں بنا رہا ہوں، میرا سالا بنا رہا ہے۔ یہ ہدایت کار دوست ہیں میرے۔"

"ان کو معلوم ہوگا کہانی کے بارے میں۔ میں چوری نہیں کروں گا تمہارا آئیڈیا یار۔ ویسے بھی یہ کوئی سرکاری راز تو ہے نہیں۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

ہدایت کار نے فلمساز کی نظروں کا اشارہ پا کے مختصراً کہانی کا خاکہ رانا کو سنادیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے اور غور سے سنتا رہا، سرہلاتا رہا اور کبھی کبھی "واہ جی واہ" کہتا رہا۔ ساری عمر ملک سے باہر رہ کے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود باپ دادا کے انداز و آداب گفتگو پر قائم رہنا بھی اس کے لیے ایک خاندانی روایت تھی۔ وہ چھچھورے لوگ ہوتے ہیں جو چار دن باہر رہ کے آتے ہیں تو آدھی اردو میں آدھی انگریزی ملا کے بولنے لگتے ہیں۔

ساری کہانی سن کے اس نے میز پر ہاتھ مارا "بھئی واہ! کیا کمال کا موضوع لیا ہے آپ نے۔ بالکل ایسی ہی فلم تھی میرے ذہن میں۔ لو جی، اب مجھ سے سودا کرلو آپ۔"

فلساز کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی "کیسا سودا رانا صاحب؟"

"اب تک کتنا خرچہ ہوا ہے آپ کا فلم پر؟"

"یہ تو...اکاؤنٹنٹ ہی بتا سکتا ہے۔"

"او جی' گولی مارو اکاؤنٹ کو اور اکاؤنٹنٹ کو۔ بس منہ سے بولو' ہم زبان پر اعتبار کرنے والے لوگ ہیں۔" رانا نے کہا "اندازہ تو ہوگا آپ کو۔ آخر پیسہ آپ کا لگا ہے۔ دس لاکھ' پندرہ لاکھ۔"

"اتنے تو نہیں۔ پانچ چھ لاکھ اٹھے ہیں۔ ایڈوانس وغیرہ دیے ہیں آرٹسٹوں کو...اور کچھ دوسرے لوگوں کو لیکن رانا صاحب..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اب یہ فلم پسند آگئی ہے مجھے تو میری ہوگئی۔ آپ کا کیا ہے' دوسری شروع کرسکتے ہو۔ میں تو اسی جگہ سے کہانی کو آگے بڑھاؤں گا۔ سب کچھ وہی رہے گا۔ مجھے تو عادت ہی نہیں دخل دینے کی۔ جس کا کام ہو اسے آزادی سے کرنے دینا چاہیے۔ آپ نے جسے بک کرلیا' کرلیا۔ جس سے ایگریمنٹ ہوگیا' ہوگیا۔ ڈائریکٹر تو خیر اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا' موسیقار' نغمہ نگار' کہانی نویس سب وہی' کاسٹ بھی وہی۔"

اور اس کے آخری الفاظ نے فلساز اور ہدایت کار پر سب کچھ واضح کردیا کیونکہ وہ مقامی لوگ تھے اور مقامی سیاست کے اسرار ورموز کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ رانا مخالف گروپ کا لیڈر تھا۔ سیف الدین کے چاچے مامے سے ان کی خاندانی دشمنی ایک روایت تھی جسے وہ سیاست کے علاوہ بھی ہر میدان میں نبھاتے تھے۔ ہاتھی کے منہ سے گنا کون چھین سکتا ہے اور دو ہاتھی گنے کے ایک ہی کھیت میں مقابل آجائیں تو پھر کاشتکار بس اپنی زمین کی خیر منائے۔

ہدایت کار نے سمجھ لیا تھا کہ سید پور کے کرم داد کو اپنا خاص بندہ قرار دینے اور اس کے تحفظ کی ضمانت کو یقینی بنانے کے لیے سیفو کو فون پر دھمکی دینے کی سیاست کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے۔ شاید رانا کے آدمی رات کے وقت ہوٹل میں موجود تھے اور انہوں نے کرم داد کی بات سن کے رانا تک پہنچادی تھی "سیفو کو ایک معمولی دیہاتی کی وجہ سے فلم سے ایسے نکال کے باہر پھینک دیا گیا ہے رانا صاحب' جیسے دودھ سے مکھی۔ اس کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔ اب اس نے دھمکی دی ہے اس پنڈ کے منڈے کرم داد کو کہ وہ اس کی لاش کے ٹوٹے کردے گا" اور اس بات پر رانا صاحب کی خاندانی رقابت اور ظرافت کی رگ پھڑکی ہوگی۔ "او یار' مزہ آجائے اگر سیفو کو وہ ڈائریکٹر دا پتر کمر پر لات مار کے باہر کردے۔ کیا اوقات رہ جائے گی اس کی۔ چلو' تم اس بندے کا خیال رکھو۔ اب تو سیفو کی جگہ وہی لے گا۔"

اور یوں کرم داد کے جانے بغیر اس کے قاتل میدان میں اترے تو اس کے محافظ بھی خاموشی سے مقابلے پر آگئے۔ کوئی ہاتھ تو لگا کے دیکھے' ہمارے بندے کو۔ ایک نے کہا۔ دوسرے نے کہا' اس بندے کو تو چھوڑنا نہیں میں نے۔

بندہ کسی کے لیے بھی اہم نہیں تھا۔ وہ محض ایک وجہ بن گیا تھا جس پر انا کی جنگ لڑی جاسکتی تھی۔

رانا نے یہاں آنے سے پہلے تمام امکانات کو ذہن میں رکھا تھا۔ شاید اپنے مشیرانِ خاص سے بھی مشورہ کرلیا تھا "ہاں بھئی کس سوچ میں پڑگئے ہو آپ؟" رانا نے بریف کیس کھولے بغیر فلساز کی طرف بڑھادیا "اس میں پورے دس لاکھ ہیں۔ سب سے اوپر ایگریمنٹ رکھا ہوا ہے۔ اس کاغذ پر دستخط کرکے مجھے دے دو تاکہ میں جاؤں' ٹائم کم ہے میرے پاس۔"

ایک گمبھیر' پرخطر اور مغرور خاموشی میں فلساز نے بریف کیس کھولا' نوٹوں کی جمی ہوئی تہ کے اوپر ہی اسٹامپ پیپر پر ٹائپ کیا ہوا قانونی معاہدہ موجود تھا جس کی رو سے اس نے اپنی زیر تکمیل فلم کے سارے حقوق رانا صاحب کو فروخت کردیے تھے۔ اس میں رقم کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

فلساز نے جیب سے قیمتی پین نکالا اور ایگریمنٹ پر دستخط کرنے لگا۔ اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ فلساز اس کا سالا ہے۔

رانا صاحب نے کاغذ کو رول کرکے ہاتھ میں تھاما اور سب سے ہاتھ ملایا۔ "گھاٹے کا سودا نہیں کیا آپ نے جناب!"

"آپ کو بھی مبارک ہو رانا صاحب" فلساز نے بادل ناخواستہ اپنی ظاہری شائستگی میں خوشی کو بھی شامل کیا۔

ڈائریکٹر سے ہاتھ ملاکے رانا نے کہا "بس جی' آپ اپنا کام جاری رکھو۔ کوئی تبدیلی ضروری ہو تو مجھ سے فون پر بات کرلینا۔ خاص طور پر کاسٹ میں۔ باقی خیر ہے۔ کہانی یا منظرنامے' موسیقی وغیرہ میں جیسا آپ مناسب سمجھو ہم تو کچھ جانتے نہیں ابھی فلم کے بارے میں۔"

ایک طرف کسی ڈیکوریشن پیس یا فرنیچر کی طرح رکھے ہوئے کرم داد نے پہلی بار اپنی موجودگی کا احساس دلایا "رانا صاحب۔ میں اس فلم میں کام نہیں کرسکتا۔"

رانا نے اسے غور سے دیکھا "تم بھی ہو فلم میں۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"کرم داد جناب۔ سید پور سے آیا تھا' فلم میں کام کرنے کے لیے۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے۔ اچھا تم یوں کرو' میرے ساتھ چلو" رانا نے اپنی کلائی کی سنہری گھڑی دیکھی "مجھے راستے میں بتانا' آجاؤ فٹافٹ۔"

ہدایت کار نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ چوں چرا کیے بغیر رانا صاحب کے ساتھ چلا جائے۔ فلساز نے بھی سہلایا تو کرم داد ان کے پیچھے لپکا۔ ان کی کئی ہاتھ لمبی چمکتی دمکتی سیاہ کار عین دروازے کے سامنے کھڑی کی گئی تھی جہاں اور کوئی گاڑی لانے کی

جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ خود فلمساز اور ہدایت کار اپنی گاڑی پارکنگ ایریا میں کھڑی کرتے تھے۔ گاڑی کے دونوں جانب مسلح گارڈز کھڑے تھے۔ چھ فٹ قد اور چھ انچ لمبی مونچھوں والے جاں نثار جن کے سینوں پر کلاشنکوف کی بیلٹ تھی اور ہاتھوں میں چمکتی ہوئی کلاشنکوف۔ ان میں سے ایک ڈرائیور تھا۔ دوسرے نے لپک کے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ گاڑی کا انجن اے سی کو چلتا رکھنے کے لیے بند نہیں کیا گیا تھا۔ کرم داد اندر کی خنک فضا میں چمڑے کی نرم گدیوں میں دھنس گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔

"تمہیں اس حرام زادے سیف الدین نے دھمکی دی تھی نا۔" رانا صاحب کا لہجہ اور آواز سب بدل گئے تھے۔

"جی جناب..... انہوں نے کہا....."

"مجھے سب معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا۔ رات کو میرے بندے موجود تھے اتفاق سے ہوٹل کے ہال میں۔ انہوں نے سب سن لیا تھا۔ اب تم بے فکر ہوجاؤ۔ ویسے تو میں نے اسے فون کرکے سمجھادیا تھا اور اس کو سمجھ بھی آگئی ہوگی اچھی طرح..... لیکن وہ..... تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

رانا صاحب نے آگے ہاتھ بڑھایا۔ ان کے باڈی گارڈ نے انہیں ایک بوتل تھمادی۔ کرم داد کا دل کسی انجانے خطرے کے احساس سے ڈوبنے لگا۔

"وہ کیا سمجھتا تھا..... ڈائریکٹر کو نکال دے گا اگر اس نے تمہیں نہ نکالا۔ میں نے فلم ہی خریدلی ہے۔ اب میں مالک ہوں۔ میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اور اسے اتنا شوق ہے تو آکے مجھ سے کہے کہ رانا صاحب، مجھے اپنی فلم میں کام دلادو۔ میں دیکھوں گا اس کے لیے کوئی رول۔"

اس کے خوشامدی باڈی گارڈ نے کہا "جناب عالی۔ کسی چوڑے کا رول ہو یا خانہ صاف کرتے ہوئے تو دے دینا۔"

رانا نے ایک قہقہہ لگایا "اوئے تو بڑا حرامی ہے بکواسی....." اور پھر بوتل منہ سے لگالی۔ باہر کی اعلیٰ تعلیم نے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔

"رانا صاحب!" کرم داد نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز اس کے حلق میں پھنس کے رہ گئی۔

"مجھے پتا ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" رانا نے کہا "یہ بتاؤ، تمہاری کیا بات ہوئی تھی ان سے۔ کتنا معاوضہ طے ہوا تھا؟"

"طے تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا جی۔ سات ہزار ایڈوانس دیے تھے۔"

"میں سمجھ گیا۔ دس فیصد....." رانا بولا "بڑے کمینے لوگ ہیں۔ صرف ستر ہزار۔ اس لیے کہ تم نئے آرٹسٹ ہو۔ کل کو یہی تمہارے پیچھے پھریں گے کہ پانچ لاکھ لے لو..... کوئی معاہدہ کیا تھا تم سے تحریری؟"

"نہیں جی۔ معاہدہ کوئی نہیں ہوا تھا" وہ بولا۔

"میں پکا معاہدہ کروں گا اور ستر ہزار نہیں، ایک لاکھ دوں گا۔ میں استحصال پسند نہیں کرتا فنکار کا۔" اس پر اب تھوڑا تھوڑا نشہ غالب آنے لگا تھا "آدھے تم کو ابھی دیے جائیں گے۔ آدھے کام ختم ہونے کے بعد۔ آج میں نے ایک پریس کانفرنس میں پیش کرنا ہے تم کو۔ وہاں تم یہ سب کچھ بتاؤ گے اخبار والوں کو۔ میں فلمی دنیا میں متعارف کرارہا ہوں تمہیں۔ کیونکہ فلمساز اب میں ہوں۔ آئی بات سمجھ میں؟"

"جی رانا صاحب!"

"تمہارا فلمی نام وہی رہے گا... سیفو...!"

"رانا صاحب، وہ مجھے مار ڈالے گا" کرم داد نے فریاد کی۔

رانا نے اسے گالی دی "اوئے کیسے مار ڈالے گا.... اس کی تو.... رانا کے بندے کو ہاتھ لگاکے تو دکھائے وہ..... تمہاری حفاظت اب ہماری ذمے داری ہے۔ تم کو رہائش کے لیے ملے گی ہماری گلبرگ والی کوٹھی۔ اس کے پچھلے حصے کی انیکسی میں دو بیڈروم ہیں۔ ڈرائنگ اور ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج۔ پیچھے گیراج میں ایک گاڑی بھی کھڑی ہوسکتی ہے۔ گاڑی بھی رہے گی تمہارے پاس اور ایسے ہی دو مسلح بندے ہروقت تمہارے ساتھ رہیں گے، ہروقت اور ہر جگہ۔"

کرم داد کے لیے اب خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ ویسے بھی رانا کی حمایت حاصل ہونے کے بعد زندہ رہنے کے چیلنج کو قبول کرنا کرم داد کو آسان محسوس ہوتا تھا۔ اسے سیف الدین پر تاؤ آنے لگا تھا جس نے اسے نہ صرف ذلیل کیا تھا، گالیاں دی تھیں اور دھمکیاں دی تھیں۔ اب وہ تنہا اور کمزور نہیں تھا۔ اس نے سیفو سے مقابلے کے لیے طاقت حاصل کرلی تھی اور قسمت یقیناً اس پر مہربان تھی۔ فلم میں اس کا رول برقرار تھا لیکن ڈائریکٹر کو بدل دینے کی دھمکی دینے والے کا پتا صاف ہوگیا تھا۔ پہلے فلمساز نے اسے نصف رقم ایڈوانس دی تھی، اسے پانچ ہزار اور مل جاتے۔ اب اسے پچاس ہزار ایڈوانس مل رہے تھے۔ وہ پہلی پارٹی کے پانچ ہزار.... یا سات ہزار بھی واپس کرسکتا تھا، باقی پچاس ہزار فلم مکمل ہونے کے بعد۔ کرم داد کا دماغ گھوم گیا۔

رانا کی گاڑی مال روڈ پر ایک بہت شاندار کئی منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ "یہ بلڈنگ بھی میری ہے۔" رانا نے کہا "اس میں میرے دفاتر ہیں۔ سیکڑوں لوگ کام کرتے ہیں۔"

کرم داد اور مرعوب ہوا۔ رانا کے ساتھ وہ لفٹ سے اس کے شاہانہ آفس میں پہنچا تو اس کی آرائش اور شان و شوکت دیکھ کے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آفس میں ہر قدم پر کھڑے ہوکے اور ہاتھ اٹھاکے سلام کرنے والوں میں ایسے خوش پوش اور خوش شکل نوجوان تھے جو فلمی ہیرو لگتے تھے اور ایسی طرحدار لڑکیاں تھیں جو بہت سی فلمی ہیروئنوں سے زیادہ حسین اور پرکشش نظر آتی تھیں۔

رانا ایک مصروف آدمی تھا۔ اس نے اپنی سیکریٹری کو کرم داد کے بارے میں ہدایات دیں۔ کرم داد پلک جھپکائے بغیر سیکریٹری کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر رانا اتنی قاتل ادا اور ساحر حسن وشباب کی مالک لڑکی کو اپنی فلم میں چانس کیوں نہیں دیتا۔ اس کی مسکراہٹ میں جادو تھا اور آنکھوں میں نشہ اور سب سے بڑھ کر اس کا لباس غارت گرِ عقل و ہوش تھا۔ ایک موقع ایسا آیا جب کرم داد کو نظر ہٹا کے دوسری طرف دیکھنا پڑا۔

رانا نے کہا "بھئی اب میں چلتا ہوں۔ میں نے سب بتا دیا ہے سیکریٹری کو۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ یہ سب کرلے گی۔"

سیکریٹری اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کا آفس ساتھ ہی تھا۔ درمیان میں صرف ایک دروازہ تھا جو رانا کے آفس کو الگ کرتا تھا۔ کرم داد ایک صوفے پر بیٹھ کے اسے کام کرتا دیکھتا رہا پھر اس نے چائے منگوائی اور کرم داد کے ساتھ بیٹھ کے ذاتی نوعیت کے بہت سے سوال کرتی رہی۔ اب وہ بہت سنجیدہ تھی۔

آہستہ آہستہ کرم داد کی شخصیت میں اعتماد پیدا ہو رہا تھا۔ اس نے ایگریمنٹ پر ایسے دستخط کیے جیسے یہ اس کے لیے پہلا اتفاق نہیں۔ اس نے پچاس ہزار نقد وصول کرکے رسید پر دستخط کیے اور پھر سیکریٹری سے کہا کہ اسے بازار جانے کے لیے گاڑی چاہیے۔ وہ اپنے لیے کچھ کپڑے خریدنا چاہتا تھا۔ سیکریٹری نے اسے بتایا کہ ایک گاڑی رانا صاحب کی ہدایات کے مطابق اس کے لیے مخصوص کردی گئی ہے۔ ڈرائیور اس کے احکامات کا پابند ہوگا۔ وہ جہاں چاہے جائے پھر ڈرائیور اسے گلبرگ لے جائے گا جہاں اس کی رہائش کا انتظام ہے۔ وہاں اس کی خدمت پر مامور ملازم ہر کام کرسکتا ہے۔ وہ کھانا بھی پکاتا ہے، کرم داد کو صرف بتانا ہوگا اور ضرورت کی ہر چیز حاضر کردی جائے گی۔

جب وہ چلنے لگا تو سیکریٹری نے دروازہ بند کرکے آہستہ سے سرگوشی میں کہا "کرم داد۔ تم گاؤں سے آئے ہو اور یہ شہر ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔"

"رانا صاحب اتنا خیال رکھنے والے ہیں۔"

"یہی سمجھا رہی ہوں میں تمہیں" اس نے کہا "یہاں کوئی غرض کے بغیر کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا۔"

"میں سمجھا نہیں" کرم داد اس لڑکی کے ہمدردانہ لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ بات تم نے کسی کو بتائی تو میری نوکری ہی نہیں جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ تم پر رانا صاحب کی اتنی مہربانیاں بے سبب نہیں ہیں۔ وہ جوا کھیلتے ہیں اور لاکھوں ہار جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک کھیل ہے۔"

"کیسا کھیل؟" وہ پریشان ہوگیا۔

"جیسے وہ ایک کتا پالتے ہیں، شکار کھیلنے یا لڑانے کے لیے۔ لاکھوں خرچ کردیتے ہیں اس پر۔ اگر وہ ہار جاتے ہیں تو بڑی آسانی سے اس کو بھی گولی مار دیتے ہیں اور کتے کی تربیت کرنے والے کو بھی۔ انہیں کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ ان کے لیے انسان کی جان سے زیادہ شوق کی قیمت ہے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے اس لیے بتا رہی ہوں۔ کہیں تم بھی ان بڑے لوگوں کی لڑائی میں مارے نہ جاؤ۔"

کرم داد پھر بیٹھ گیا "میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جی۔"

"تم نے وہ ضرب المثل تو سنی ہوگی کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں" اس نے اپنی نگاہ دروازے پر رکھی اور سرگوشی میں بولتی رہی "کبھی مرغوں کی لڑائی دیکھی ہے؟"

"ہاں جی۔ سید پور میں بھی ہوتی تھی۔"

وہ مسکرائی "تو بس یہ سمجھ لو کہ تم بھی ایک مرغے ہو۔ جو مرغے لڑاتے ہیں، انہیں مرغ کی جان کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ صرف ہار جیت میں ہوتی ہے ان کی ساری دلچسپی۔ سیاست کے کھیل میں انسانوں کو لڑایا جاتا ہے۔ اس سے اوپر دنیا کی بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو لڑاتی ہیں۔"

اب کرم داد کی رائے اس لڑکی کے بارے میں بدل چکی تھی۔ اپنے ناز و انداز سے بے حیا اور فاحشہ نظر آنے والی وہ لڑکی ایک دردمند دل رکھتی تھی "مجھے کچھ اندازہ تو ہوگیا ہے جی کہ معاملہ ضد بازی کا ہے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے ہو تم۔ چوہدری سیف الدین اور رانا صاحب دونوں نے تمہیں ایک چیلنج بنالیا ہے۔ ان کے لیے یہ اپنی طاقت اور غرور کا مقابلہ ہے۔ سیفو کہتا ہے کہ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ رانا نے شرط لگائی ہے ایک لاکھ کی کہ اچھا اسے مار کے دکھاؤ۔"

کرم داد کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے "ایک لاکھ کی شرط؟"

"ہاں۔ یہ فلم کے کردار کی بات تو بہانہ بن گئی ہے۔ رانا صاحب کا کیا تعلق فلموں سے اور انہیں ضرورت بھی کیا ہے اس چکر میں پڑنے کی۔ بڑے بڑے فلم اسٹار ان کے دوست ہیں۔ ہر ہیروئن سے دوستی ہے ان کی۔ اس کھیل میں پچاس ہزار انہوں نے تمہیں نقد دے دیے۔ سمجھ لو اتنے ہی اور خرچ ہو جائیں گے تم پر.... مقابلہ شروع ہو چکا ہے۔ آگے معلوم ہے کیا ہوگا؟ فلم میں تمہارا کردار بدل دیا جائے گا۔ فلم کا نفع اور نقصان اس ایک لاکھ کے علاوہ ہوگا۔"

"وہ کس لیے جی؟"

"سیف الدین کو ذلیل کرنے کے لیے۔ تمہاری صورت اس سے ملتی ہے نا، تم کو فلم میں کوئی بہت گھٹیا کام کرتے دکھایا جائے گا۔ مثلاً تم کو رانا صاحب کے ملازم کا رول ملا تو تم ان کے پاؤں دباتے، حقہ بھرتے، کتوں کو نہلاتے نظر آؤ گے یا اس سے بھی زیادہ ذلت کے کام کرتے۔"

کرم داد کو رانا کے ڈرائیور کا مشورہ یاد آیا۔ اس نے کہا تھا کہ

سیفو کو بھنگی بنادیا جائے فلم میں۔

سیکریٹری بولتی رہی "تمہارا نام بھی وہی رکھا گیا ہے۔ اس سے شہر میں سیفو کی بہت بے عزتی ہوگی۔ سب سمجھیں گے کہ رول کرنے والا سیفو ہے۔ تم دیکھ لینا خود رانا صاحب بھی فلم کی کاسٹ میں شامل ہو جائیں گے۔"

کرم داد کا دماغ ماؤف ہو گیا "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے جی؟"

"یہ بھی میں بتاؤں۔ تمہیں اپنی جان بچا کے بھاگ جانا چاہیے بے وقوف۔ واپس اپنے گاؤں چلا جانا چاہیے۔ اپنی بیوی کے پاس اور اندھے باپ کے پاس، ابھی وقت ہے" سیکریٹری اچانک بہت اداس ہو گئی تھی۔

"مگر..... میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔"

"یہ پچاس ہزار چھوڑ دو۔ واپس کر دو رانا صاحب کو۔ میں کہہ دوں گی کہ معلوم نہیں کیوں کرم داد نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس ایگریمنٹ کو بھی پھاڑ کے پھینک دوں گی۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ حفاظت صرف خدا کرتا ہے۔ رانا صاحب کے محافظ تمہیں کیسے بچا سکتے ہیں.... وہ چوبیس گھنٹے تمہارے ساتھ رہیں تب بھی یہ بہت مشکل ہے۔ تم گھر سے نکلو گے، باہر پھرو گے۔ بازار جاؤ گے۔ کوئی کہیں بھی گولی مار سکتا ہے تمہیں۔ راہ چلتی گاڑی سے یا کسی چھت پر سے۔"

پچاس ہزار کے نوٹ ابھی تک کرم داد کے ہاتھوں میں تھے "میں واپس کیسے جا سکتا ہوں جی۔ میں مقروض ہوں۔ سات ہزار پہلے لیے تھے میں نے۔ اس میں سے کچھ خرچ ہو گئے ہیں۔"

"دیکھو تم جوان آدمی ہو۔ کچھ بھی کر سکتے ہو۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے تو کہیں اور جاؤ۔ یہاں سیکڑوں آتے ہیں تم جیسے۔ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں کچھ مگر ناکام ہوں تو لوٹ جاتے ہیں اپنے گھر، اپنی دنیا میں۔ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم غلط ہاتھوں میں پڑ گئے۔ شاید یہ بدقسمتی تھی تمہاری کہ ایک ہدایت کار کو تمہاری صورت میں ایک کردار کی مشابہت نظر آ گئی اور وہ کردار تھا سیفو کا..... رانا صاحب کے روایتی حریف اور دشمن کا۔"

"آپ یہ سب کیوں بتا رہی ہو جی مجھے؟"

"اس لیے کہ تم کو کچھ معلوم نہیں بے وقوف" وہ جھلا کے بولی "لالچ میں جان دینا چاہتے ہو تو جاؤ۔ جو جی میں آئے کرو۔ مجھے تمہارا نہیں تمہارے بیوی بچوں کا اور اندھے باپ کا خیال تھا۔ بس اتنی مہربانی کرنا کہ مجھے اس ہمدردی کا الٹا صلہ مت دینا۔ کسی سے ان باتوں کا ذکر مت کرنا۔"

"نہیں جی۔ میں اتنا کمینہ نہیں ہوں۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ میں جو بھی کروں گا سوچ سمجھ کے کروں گا۔" کرم داد نے کہا۔

اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ لڑکی ہمدردی میں نہیں، کسی اور وجہ سے اس کی حوصلہ شکنی کر رہی ہے۔ ویسے تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شہر میں رانا جیسے رئیس اور طاقتور لوگ انسانوں کی جانوں سے اس طرح کھیلتے ہوں جیسے سید پور میں لوگ مرغے لڑاتے تھے۔ رانا صاحب نے اسے مسلح محافظ فراہم کیے ہیں اور وہ خود بھی اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ خطرے کی بات اگر اس کے لیے ہے تو کیا رانا صاحب کے حریف کے لیے نہیں ہے؟ اگر وہ مارا گیا تو کیا رانا صاحب کہیں گے کہ چلو یہ بازی تم جیت گئے، کرم داد ضائع ہوا، کوئی بات نہیں۔ کیا وہ اس سے حساب برابر نہیں کریں گے۔

سیکریٹری نے اسے پچاس ہزار کے نوٹ جیبوں میں ٹھونس کے مایوسی سے جاتے دیکھا۔ اس کو دولت کی مقناطیسی کشش نے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ اس کے لیے انکار کو ناممکن بنا دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی ایک ایسے مستقبل کے لیے داؤ پر لگانے کے لیے تیار تھا جس میں عزت، دولت اور شہرت سب مل سکتی تھی۔ وہ ساری عمر چاچے دی ہٹی پر بیٹھنے کے لیے سید پور جانے کے خیال سے مفاہمت نہیں کر سکتا تھا۔

سیکریٹری ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھی۔ دروازے کو اندر سے لاک کر کے وہ اپنی جگہ آ بیٹھی اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگی۔

دوسری طرف سے سیفو نے کہا "ہیلو.....!"

"سیفو..... وہ نہیں مانتا" سیکریٹری نے کہا "میں نے بہت کوشش کی۔"

"اوہ ڈارلنگ! یہ کیسے ہو سکتا ہے" سیفو ہنسا "تم کوشش کرو اور کوئی نہ مانے۔ ایسا تو پتھر کا بت ہی ہو سکتا ہے۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ تمہارے ایک اشارے پر ہم آسمان سے زمین پر کود جائیں سر کے بل۔"

"سیفو۔ پلیز بی سیریس۔ پچاس ہزار نقد دیکھ کے اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ میرا جادو اس پر کیا اثر کرتا۔"

"یہ تو اچھی خبر نہیں سنائی تم نے۔"

"ایک صورت ہے۔ اگر تم برا نہ مانو.....؟"

"وہ کیا؟" سیفو نے کہا۔

"میں آج رات جاتی ہوں اس کے پاس۔"

سیفو نے کہا "اس کے بیڈ روم میں؟ میں اس کے ساتھ تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔"

"پوری بات سنو سیفو! میں صرف تھوڑی سی گھاس ڈالوں گی اسے۔ وہ گدھا ہے۔ فوراً چرنے لگے گا لیکن اتنی ہمت نہیں ہے اس میں کہ وہ مجھ پر دست درازی کر سکے۔ میں اپنی حفاظت بہت اچھی طرح کر سکتی ہوں۔ میں یہ ظاہر کروں گی کہ اس کی محبت نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں اسے پچاس ہزار پیش کروں گی کہ یہ میری ساری زندگی کی بچت ہے۔ ظاہر ہے یہ قیمت تم ادا کرو گے پھر میں اس کاٹھ کے الو سے کہوں گی کہ یہ رقم رانا صاحب کو واپس کر دو اور ان سے کہہ دو کہ تم نے فلموں میں کام کرنے کا ارادہ بدل

دیا ہے۔ تم معاہدہ ختم کرنا چاہتے ہو کیونکہ تمہیں دبئی کا ویزا مل گیا ہے۔ تم نے بہت پہلے اپلائی کیا تھا۔ اب جواب آیا ہے اور تم یہ چانس گنوانا نہیں چاہتے۔ فلموں میں کامیابی تو ایک جوا ہے اور اس میں جو خطرات نظر آرہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اس کا دبئی چلے جانا ہی بہتر ہے۔"

"اوہ سویٹ ہارٹ۔ یو آر اے جینئس۔" سیفو نے فون پر چومنے کی آواز پیدا کی "کیا وہ مان جائے گا؟"

"مانے گا کیسے نہیں جب چپڑی اور دو دو ملیں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک تو لالچ ہے پیسے کا۔ پچاس ہزار دیکھ کے اس کی آدھی مزاحمت تو ویسے ہی ختم ہو جائے گی۔ اپنی بات منوانے کے لیے مجھے خلوت میں اسے دوسری طرح سمجھانا پڑے گا۔" وہ ہنسی "زیادہ قریب سے' آخر مرد بھی ہے وہ۔"

"تم کو رسک لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نو رسک نو گین" وہ بولی "حد سے آگے نہیں بڑھنے دوں گی میں اسے۔ وہ بزدل اور ڈرپوک ہے۔"

"اس نے سینے سے لگایا تمہیں' آغوش میں لے کر چوم لیا پھر؟"

وہ شوخی سے ہنسی "پھر کیا.....میں گھس جاؤں گی...؟ یا سیکنڈ ہینڈ ہو جاؤں گی۔ تم دیکھو میں بھی یہ تمہیں بچانے کے لیے کروں گی۔ اپنی عزت کے لیے تم اسے قتل کرنے پر تیار تھے۔ گڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے آخر؟ جب وہ رانا کو انکار کردے گا تو رانا خود نمٹ لے گا اس سے۔ وہ انکار سننے کا عادی نہیں ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ وہ ایسے وقت میں رانا کو پچاس ہزار واپس کرنے جائے' جب رانا بالکل آؤٹ ہو۔ نشے میں دھت ہو۔ اس کی بات سنتے ہی اسے گولی مار دے۔"

"اوکے' اوکے۔ ڈو اِٹ یور وے۔ مجھے پورا بھروسا ہے تمہاری ذہانت پر۔"

"اور محبت پر نہیں ہے؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے جانِ من۔"

"سیفو۔ اب مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں آگ سے کھیل رہی ہوں۔ اگر کسی دن رانا کو شک بھی ہو گیا.....کہ تم مجھ سے شادی کررہے ہو۔"

"ڈونٹ وری۔"

"وری کیسے نہ کروں۔ رانا کے نمک خوار ہر جگہ موجود ہیں۔ کسی نے دیکھ لیا مجھے تمہارے ساتھ تو تمہیں اسی وقت پتا چلے گا جب وہ مجھے زندہ دفن کرچکے ہوں گے۔ ویسے بھی عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے' یہ بات ایسے ہی مشہور نہیں ہوئی۔ میری رپورٹ مل گئی ہے۔"

"کیا ہے رپورٹ؟" سیفو نے کہا۔

"پوزیٹو۔ تم نے تو ابھی تک بات بھی نہیں کی ہے اپنے ڈیڈی سے۔ میں زیادہ دن انتظار نہیں کرسکتی۔"

"میں آج ضرور بات کرلوں گا اور وہ کون سا انکار کریں گے۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میری پسند کو مسترد کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ میں وہی کروں گا جو میرا جی چاہے گا۔ آخر انہی کا بیٹا ہوں۔ آج کیا دن ہے' یہ کرم داد والا مسئلہ ختم ہو جائے' اس کے بعد تم آجاؤ استعفیٰ دے کے۔ شادی ہونے تک کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے گھر بیٹھو۔ تم مالکن بننے والی ہو۔ تمہیں نوکری کی نہیں' اپنے اس خادم کی ضرورت زیادہ ہوگی۔"

اس نے شرما کے کہا "پچاس ہزار بھجوادو مجھے کسی کے ہاتھ مگر دیکھو' ذرا احتیاط سے۔ رانا کو پتا نہ چلے۔"

"کسی کو پتا نہیں چلے گا سویٹ ہارٹ!" سیف الدین نے ریسیور رکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا پھر اس نے وہ کیسٹ نکال لیا جس پر ان کی ساری گفتگو ریکارڈ ہو چکی تھی۔ اس کے پاس ایسے بہت سے کیسٹ تھے۔ پازیٹو رپورٹ کا ذکر نہ کرتی تو شاید یہ معاملہ کچھ دن اور چل جاتا۔ رپورٹ کا حوالہ دینے کا مقصد ہی اس پر دباؤ بڑھانا تھا۔ اس نے کھل کر تو بلیک میل کرنے کی دھمکی نہیں دی تھی مگر وہ ایک ذہین اور بہت بہادر لڑکی تھی۔ بہادر نہ ہوتی تو اس کے ساتھ محبت کے اس خطرناک کھیل میں شریک ہی کیوں ہوتی اور بلاشبہ بہت اچھی لڑکی تھی مگر آدمی ہر اچھی لڑکی سے شادی کیسے کرسکتا ہے۔

چوہدری سیف الدین عرف سیفو نے بزر دبا کے اپنی سیکریٹری کو طلب کیا "کیشئر سے کہو' مجھے پچاس ہزار کیش چاہیے اسی وقت۔"

"یس سر!" وہ اس کے سامنے میز پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گئی۔

سیفو نے کھڑے ہو کے بازو اس کے گلے میں حمائل کر دیے "آدمی کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے' محاورہ تو یہی ہے نا۔"

وہ ہنس پڑی "محاورے الٹ بھی گئے ہیں۔ اب چراغ کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے۔"

"تم جانتی ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میرا ایک کام کرو گی۔ معاملہ رازداری کا ہے" سیفو اس پر جھک گیا۔

"آپ مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں سر! کام کیا ہے؟"

"تمہیں یہ پچاس ہزار روپے ایک جگہ پہنچانے ہیں۔ اس طرح کہ کسی کو بھی پتا نہ چلے۔ اس کے بعد کل کسی ڈاک خانے سے ایک پارسل کی رجسٹری کرانی ہے۔ پرسوں چھٹی کا دن ہے' پارسل تیسرے دن رانا کو ملے گا۔"

"رانا کو۔ کیا پارسل میں بم ہوگا؟" اس نے سیفو کے ہاتھوں کو روکا۔

"نہیں۔ کچھ کیسٹ ہیں۔ ان کا پارسل بھی تم ہی بناؤ گی۔ تم

جانتی ہو ہمارے درمیان سیاسی اور کاروباری رقابت ہے..... کیسٹوں میں کچھ ایسی ہی باتیں ہیں۔ رانا کا بھٹا بیٹھ جائے گا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "میں ایک تیر سے دو شکار کر رہا ہوں۔"
"آپ بہت چالاک ہیں سر!" اس نے مزاحمت ترک کردی۔
سیفو نے دروازہ بند کردیا۔ وہ واقعی بہت چالاک تھا۔ وہ ایک تیر سے دو نہیں تین شکار کر رہا تھا۔

○☆○

سب کے جانے کے بعد اچانک وہ بالکل تنہا ہوگئی تھی۔ اس سے ہمدردی کرنے اور اسے رسمی انداز میں دلاسا دینے والے دن بھر آتے رہتے تھے اور وہ خاموشی سے رٹے رٹائے الفاظ سن کر ایک ایک کی صورت دیکھتی رہتی تھی۔ خود اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ سب کہنے کو اپنے تھے۔ دو کرم داد کے چاچے تھے اور دو مامے۔ ان سب کا اصرار ہوتا تھا کہ گھر میں اکیلے رہنے کے بجائے وہ ان کے ساتھ چلے لیکن وہ کہیں بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے ساتھ قرابت داری جتانے میں پیش پیش رہنے والے اور حسنِ سلوک میں ایک دوسرے کے مقابلے پر نظر آنے والے درحقیقت کیا چاہتے ہیں۔ آج اس نے سب کو ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ "میں اپنا گھر چھوڑ کے کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"
"لیکن تم اکیلی کیسے رہو گی؟"
"وہ آپ دیکھ لو گے۔ آپ سب ہی اپنے گھر جائیں۔ میری فکر نہ کریں۔ کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ۔ کوئی مجھے بھی مار جائے گا۔ اس نے تنگ آکے ایک دن سب کو رخصت کردیا جو سوم کے بعد بھی وہاں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے اور ان سب کے ریکارڈ کی سوئی ایک ہی جگہ اڑ گئی تھی۔ یا ہمارے گھر چلو یا پھر ہم آجاتے ہیں یہاں رہنے۔ جوان جہان عورت کا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔
باری باری کرم داد کی تلاش میں جانے والا ایک چاچا اور ایک ماما تھک ہار کے واپس آگئے تھے۔ خدا جانے وہ لاہور گئے تھے یا راولپنڈی میں ہی پھرتے رہے تھے۔ ان دونوں کا شدید اصرار تھا کہ اب چاچے دی ہٹی کو بند نہیں رہنا چاہیے۔ گزر اوقات کے لیے کوئی وسیلہ تو بنے۔ وہ دونوں ہی دکان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے مگر عائشہ نے ان کی ساری امیدوں پر یہ کہہ کے پانی پھیر دیا کہ دکان پر وہ خود بیٹھے گی۔
"یہ ہم برداشت نہیں کرسکتے کہ ہمارے خاندان کی بہو..."
"نہیں ہوں میں تمہارے خاندان کی بہو۔" عائشہ نے کرم داد کے چاچے کو دوٹوک لہجے میں جواب دیا "کرم داد سے ہے تمہارا رشتہ..... جب وہ آئے تب آنا۔"
مامے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "نیک بخت۔ دکان پر بیٹھ کے سودا بیچنا آسان ہے لیکن دکان کے لیے سودا لانے شہر کی منڈی کون جائے گا؟"

"چلی جاؤں گی میں۔ بس میں بیٹھ کے۔"
سب کا خیال تھا کہ عائشہ پاگل ہوگئی ہے۔ وہ ایسی بدتمیز اور بددماغ پہلے تو نہیں تھی۔ جب سے اس کا شوہر اسے کچھ بتائے بغیر غائب ہوا تھا اسے چپ لگ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ سب کو اس کے اچانک گاؤں چھوڑ جانے کا سبب معلوم ہوگیا تھا۔ عائشہ اس کے ساتھ لاہور جانے پر بضد تھی اور کرم داد کا خیال تھا کہ ابھی اسے سید پور میں ہی رہ کے ابا کی دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ بعد میں اگر لاہور میں رہنے کا انتظام ہوگیا تو وہ سب کو بلالے گا۔ اس کی بات بالکل جائز تھی مگر عائشہ نے اس سے جھگڑا کیا تو وہ رات کو گھر سے نکلا اور پھر لوٹ کے نہیں آیا۔
لاہور میں اس کا کوئی پتا ٹھکانا نہیں تھا۔ عائشہ کو رہ رہ کے اپنے غصے پر غصہ آتا تھا۔ اس نے طیش میں آکے وہ دو ہزار بھی کرم داد کے سامنے پھینک دیے تھے جو اس نے چھپ کے معاون ہدایت کار سے وصول کئے تھے۔ وہ اس کے نام سے ناواقف تھی۔ اس نے گھر آکے کرم داد سے کہا تھا کہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے آؤ۔ اسے فلموں میں بہت اچھا چانس مل سکتا ہے کیونکہ اس میں بہت صلاحیت ہے۔ وہ بہت سی ہیروئنوں کا چراغ گل کرسکتی ہے۔
عائشہ نے اتفاق سے دروازے کی اوٹ میں رہتے ہوئے ان کی ساری باتیں سن لی تھیں اور پھر اپنے طور پر اس سے معاہدہ کرلیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کرم داد کے ساتھ لاہور جاسکتی ہے۔ کرم داد اگر فلموں میں کام کرسکتا ہے تو وہ بھی کرسکتی ہے اور یہ خود فلم والوں کی رائے ہے تو غلط نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ کمینہ ایسے فرار نہ ہوتا تو وہ اسے اکیلا کبھی نہ جانے دیتی۔
دو ہزار کے نقصان سے زیادہ بڑا نقصان یہ ہوا تھا کہ اس نے معاون ہدایت کار کا دیا ہوا کارڈ بھی کرم داد کے سامنے پھینک دیا تھا اور وہ کارڈ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ عائشہ کو کارڈ پر لکھے ہوئے نام اور پتے کے کھو جانے کا بہت صدمہ تھا۔ وہ نہ ہدایت کار کا نام جانتی تھی اور نہ کسی اور کا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یونٹ جس فلم کی شوٹنگ کرنے سید پور آیا تھا اس کا کیا نام تھا۔
ایک ہفتے تک وہ غصے اور پشیمانی کے جذبات میں مبتلا کرم داد کی طرف سے ملنے والی کسی خبر کا بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔ اسے امید تھی کہ غصہ اتر جانے کے بعد وہ بھی پچھتائے گا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو اور اپنے اندھے باپ کو خط لکھ کر ضرور اپنی خیریت کی اطلاع دے گا۔ اپنے پتے سے آگاہ کرے گا اور یہ بتائے گا کہ اس نے بیوی بچوں کو بلانے کا انتظام کرلیا ہے۔
دسویں دن اچانک کرم داد کی طرف سے چالیس ہزار روپے کا منی آرڈر اس کے نام موصول ہوا۔ منی آرڈر لانے والا ڈاکیا ہانپتا ہوا مبارک مبارک چلاتا نمودار ہوا اور اس نے عائشہ کے سامنے دعاؤں کے اور مبارک بادی کے ڈھیر لگادیے۔ وہ کاکے کو گود میں اٹھا کے چومتا رہا اور کرم داد کے ابا کو چھپر پھاڑ کے ملنے والی دولت

پر دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان قرار دیتا رہا۔ تھوڑی دیر میں سارا گاؤں ان کے آنگن میں بھر گیا۔ آنے والے سب ڈاکیے جیسی حرکتیں کرتے رہے۔ چالیس ہزار نقد اتنی بڑی دولت تھی جس کا وہاں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

منی آرڈر عائشہ کے نام پر تھا مگر اس نے صرف انگوٹھا لگایا۔ رقم خود کرم داد کے ابا نے وصول کی۔ اس نے عائشہ کو پاس بٹھائے رکھا تھا تاکہ ڈاکیا گنتی میں گڑبڑ نہ کرے۔ وہ شہر سے رقم لایا تھا اور بار بار خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ سائیکل پر اسے راستے میں کسی نے لوٹا نہیں۔ کرم داد کے ابا نے اسے مٹھائی کے لیے صرف پانچ روپے دیے تو وہ بہت مایوس ہوا تھا پھر عائشہ نے اس کو سو کا نوٹ دیا تو اس کا دعاؤں اور مبارک بادی والا کیسٹ دوبارہ چل پڑا۔ کرم داد کے ابا نے بعد میں بہو کو بہت ڈانٹا کہ یہی فضول خرچی کا سلسلہ جاری رہا تو چالیس ہزار میں سے چہلم تک کے لیے پیسے نہیں بچیں گے۔

عائشہ نے اس سے رقم چھین لی۔ ”ابھی کسی کا چہلم نہیں ہو رہا ہے۔ ایسی منحوس بات منہ سے نکالنے کی کیا ضرورت ہے خوشی کے موقع پر۔“

ابا مجبور نہ ہوتا تو رقم کبھی بہو کے حوالے نہ کرتا۔ اس نے شور ضرور کیا ”بے وقوف عورت! کہاں رکھے گی اتنا پیسہ۔ مجھے دے، میں خاموشی سے ایک خفیہ جگہ دبا دوں۔ اندھا ہوں تو کیا، اپنے گھر کا بھی پتا ہے مجھے اور باہر کا بھی اندازہ ہے۔“

”میں بھی کرسکتی ہوں یہ کام“ عائشہ نے کہا ”اور تم سے اچھا کرسکتی ہوں۔ میں پیسہ لے کر بھاگ نہیں جاؤں گی۔“

”ڈاکیا بتا رہا تھا، کرم داد نے لکھا ہے کہ اس سے مکان پکا کرالو۔ دکان میں اور سامان ڈال لو۔“ وہ اکیلا بولتا رہا کہ اس دولت کا مصرف کیا ہوگا۔ عائشہ نے ایک جگہ سے دیوار میں موکھا بنایا۔ کچے گارے کی دیوار میں یہ جگہ عین چولھے کے پیچھے تھی۔ دوبارہ چولھا بنانے سے پہلے اس نے انتالیس ہزار پانچ سو روپے پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ کر اندر رکھے اور پھر گارے سے دیوار برابر کردی۔ اینٹوں کو دوبارہ چن کر اس نے لکڑیاں جلادیں تاکہ کسی کو فرق محسوس نہ ہو۔

اس نے اب طے کرلیا تھا کہ وہ لاہور جائے گی۔ منی آرڈر فارم پر کرم داد کا پتا بھی تھا اور یہ حصہ ڈاکیے نے پھاڑ کے کرم داد کے ابا کو دے دیا تھا۔ گاؤں میں مکان پکا کرانے اور دکان میں سامان ڈلوانے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کرم داد دس دن میں اتنا پیسہ کما سکتا تھا تو وہ بھی کمائے گی پھر وہ یہاں کیوں رہیں۔ وہ لاہور میں کوٹھی بنائیں گے۔ اسے فلم والے کی بات یاد تھی کہ عائشہ کے سامنے ہر ہیروئن کا چراغ گل ہوجائے گا۔ اسے عزت، شہرت اور دولت سب مل سکتی ہے کیونکہ اس میں صلاحیت ہے۔ یہ بات اس نے ایسے ہی تو نہیں کہی ہوگی اور ایکٹنگ کرنا کیا مشکل ہے۔ کرم داد کرسکتا ہے تو میں بھی کرسکتی ہوں۔

اس رات وہ آئینے میں خود کو دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں سرمہ ڈال کے اور بال بنا کے، بال بکھرا کے۔ اس نے کپڑوں کے بغیر بھی اپنے جسم کو ہر زاویے سے دیکھا اور اس کا یقین پختہ تر ہوتا گیا کہ خدا نے اسے وہ سب کچھ دیا ہے جس نے فلم والے کی عقل خبط کردی تھی۔ وہ ہیروئن بن سکتی ہے۔ اسے کرم داد پر بھی بہت پیار آرہا تھا۔ غصہ تو اس نے پہلی بار کیا تھا ورنہ وہ کتنا چاہتا تھا عائشہ کو اور کاکے کو۔ گاؤں میں سب اپنی بیویوں کی خوب ٹھکائی لگاتے تھے۔ اس روز پہلی بار کرم داد نے اس کے دو تھپڑ مارے تھے۔ غلطی خود اس کی تھی۔ وہ ذرا حوصلے سے کام لیتی اور کرم داد کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی تو...

اچانک عائشہ کو باہر سے ابا کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ صحن میں چارپائی ڈال کے سوتے تھے۔ قریب ہی بچھی ہوئی دوسری چارپائی عائشہ کی تھی جس پر کاکا سویا پڑا تھا۔ عائشہ کو رات میں ایک بار تو ضرور اٹھنا پڑتا تھا۔ ابا کو نیند نہیں آتی تھی اور وہ جب تک جاگتا رہتا تھا، حقہ پیتا رہتا تھا اور کھانستا رہتا تھا۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت وہ عائشہ کو پکارنے لگتا تھا کہ حقہ ٹھنڈا ہوگیا ہے اور نیند میں جھومتی جھولتی عائشہ چلم خالی کرکے نیا تمباکو ڈالتی تھی اور سلگتے اپلے رکھ کے پھر سو جاتی تھی۔

آج اس کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کا تخیل محوِ پرواز تھا اور وہ کھلی آنکھوں سے ارمانوں کے خواب میں بہت کچھ دیکھ رہی تھی جو ابھی بہت دور اس کی نگاہ سے اوجھل مستقبل میں روپوش تھا۔ جیسے سورج جو زمین کے دوسری طرف تھا لیکن آہستہ آہستہ سپیدۂ سحر کی طرف بڑھ رہا تھا اور رات کی آخری کالی حد پر اجلی دھوپ والا دن موجود تھا۔

چالیس ہزار روپے نقد کی ملکیت کے اس احساس نے ہی عائشہ کے سینے میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے کیا کچھ خریدا جاسکتا ہے؟ خوب صورت کپڑے گہنے، ہیل والے ولایتی جوتے۔ دو پہیوں والی موٹر سائیکل یا پھر پرانی کار مگر جلدی کیا ہے؟ جہاں اتنی زندگی خواب دیکھتے گزاری وہاں تعبیر کے لیے تھوڑا انتظار اور سہی۔ نئی کار لیں گے، کوٹھی بھی بنو لیں گے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ عائشہ کو گدگدا رہی تھیں پھر وہ اندر آگئی اور لالٹین کی لو اونچی کرکے آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے لگی۔

ابا نے چلا کے کہا ”اوئے ظالمو، نہ مارو مینوں“ تو اس نے گھبرا کے کپڑے پہنے اور دروازے کی اوٹ سے باہر جھانکا۔ صحن کا منظر دیکھ کر عائشہ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ایک شخص ڈھاٹا باندھے ابا کے سینے پر سوار تھا۔ دوسرا اس کے سرہانے کلہاڑی لیے کھڑا تھا۔ آخر شب کا آدھا چاند عین صحن پر تھا۔ اس کی روشنی میں کلہاڑی کے پھل کی سرد سفاک چمک نے عائشہ کی رگوں میں لہو کو منجمد کردیا۔

سینے پر چڑھا شخص ابا کا گلا دبانے لگا "بول۔ پیسہ کہاں ہے؟ جلدی بول۔"

"اوئے میرے پاس کیا ہے نامراد!" ابا نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

اس نے ابا کے منہ پر تھپڑ مارا اور دوسرے نے کلہاڑی بلند کی "بکواس میں وقت ضائع مت کرو ورنہ خود ضائع ہو جائے گا۔"

"کہاں دبایا ہے وہ چالیس ہزار روپیہ جو کرم داد نے بھیجا تھا؟" اس نے گلے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ بڑھایا۔

"اوئے خیال سے.... بڈھا کچھ بتانے سے پہلے ہی نہ مرجائے" کلہاڑی والے نے کہا۔

"یہ ایسے نہیں بتائے گا' اس کی بہو کہاں ہے؟"

"پتا نہیں لیکن اس کا پوتا ہے یہاں" کلہاڑی والا بولا "ابھی اس کا گلا دباؤں گا تو یہ بولے گا۔"

عائشہ ایک چیخ مار کے باہر لپکی "کاکے کو کچھ مت کہو۔"

اس وقت ابا نے چلا کے کہا "تو کیوں آئی ہے یہاں۔ میں لے جاتا ہوں انہیں باہر۔ جہاں پیسہ گاڑا تھا میں نے۔"

عائشہ نے لپک کے کاکے کو گود میں اٹھالیا۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا "تم کو پیسہ چاہیے کسی کی جان تو مت لو۔"

ابا نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا "بے شک سب لے لو تم مگر ہمیں مت مارو۔ میں بتاتا ہوں تمہیں پیسہ کہاں ہے۔ چلو میرے ساتھ۔"

دکھ اور حیرانی سے بت بنی عائشہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابا کو ان کے ساتھ باہر جاتا دیکھتی رہی جو اس کے قاتل تھے۔ اپنی اندھی آنکھوں سے وہ راستہ دیکھتا' لڑکھڑاتا' زیر لب کچھ بولتا صحن کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عائشہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آخر وہ انہیں کہاں لے جارہا ہے۔ اسے تو خود بھی معلوم نہیں کہ پیسہ کہاں ہے؟

پھر وہ سمجھ گئی۔ ابا اسے اور اپنے پوتے' کرم داد کی نشانی کو بچانے کے لیے اپنے قاتلوں کے ساتھ جارہا تھا۔ اس نے عائشہ سے کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔ دیکھ میں انہیں دور لے جارہا ہوں۔ تو پیسے کی فکر مت کر۔ اپنی اور کاکے کی جان بچا کے نکل جا۔ بھاگ کے چلی جا اپنے گھر۔ جا تیرا رب راکھا۔

عائشہ دبے پاؤں صحن کے کھلے دروازے تک گئی۔ ابا انہیں گھر سے چالیس قدم دور لے گیا تھا اور وہ ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ ابا انگلی سے زمین کی طرف اشارہ کر رہا تھا پھر وہ جھکا اور اپنی بوڑھی انگلیوں سے زمین کھودنے لگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں کچھ نہیں ہے' سوائے موت کے۔

عائشہ دیوار کے ساتھ ساتھ مخالف سمت میں چلنے لگی۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور اس نے سوتے ہوئے کاکے کو اپنے ساتھ چمٹا رکھا تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں پہنچتے ہی وہ دوڑنے اور چیخنے لگی۔

آج ایک مہینے بعد بھی ایک منظر عائشہ کی آنکھوں میں تصویر کی طرح ٹھہر گیا تھا۔ ابا درخت کے نیچے اوندھا پڑا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا تو اس کا سر دو حصوں میں تقسیم تھا اور خون ایک چھوٹے سے گڑھے میں جمع ہو رہا تھا جو ابا نے خود ہی کھودا تھا۔ ابا کا مغز بھی اس خون میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کو چیخ کے ساتھ ابکائی آئی اور وہ کھڑے کھڑے گر گئی تھی۔

اب گاؤں میں رہنا عذاب کاٹنے والی بات تھی۔ عائشہ ہر رات دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کے اور اس کے سامنے اپنی چارپائی لگا کے سوتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ لالچی بھیڑیئے پھر آسکتے ہیں۔ عائشہ نے سب کے سامنے یہی کہا تھا کہ وہ سب کچھ لے گئے مگر وہ جو مشتعل ہو کے ابا کے سر کو کلہاڑی سے دو ٹکڑے کر گئے تھے' اسی گاؤں میں موجود تھے اور جانتے تھے کہ یہ جھوٹ ہے۔ شاید انہیں بڈھے کے ہاتھوں بے وقوف بننے کا سخت صدمہ ہو گا۔ دولت تو کرم داد کی بیوی کے پاس تھی۔ چالاک بڈھے نے اپنی جان دے کے اسے بچالیا۔ شاید انہیں یہ خوف بھی ہو گا کہ کہیں عائشہ نے ان کو آواز سے یا کپڑوں سے پہچان نہ لیا ہو۔ ابھی گھر میں دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ شاید اسی خوف نے انہیں روک رکھا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ دولت گاؤں سے باہر نہیں گئی۔ گاؤں میں کوئی بینک بھی نہیں تھا۔ کرم داد نے اتنی دولت گاؤں بھیج کے بڑی غلطی کی تھی۔

عائشہ حواس بحال رکھنے کے باوجود انہیں پہچان نہیں سکی تھی۔ چنانچہ اب اس کے لیے کوئی بھی شک سے مبرا نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اپنے باپ کو چھوڑ سکتی تھی۔ بھائی سب ایک سے لالچ کے مارے ہوتے تھے۔ اس کا اپنا بھائی' کرم داد کے چاچے اور مامے اور سید پور کا ہر جوان آدمی۔ عائشہ نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ وہ جوان تھے اور قد آور تھے۔

اچانک دروازے پر دستک سن کے وہ اچھل پڑی۔ اس وقت کون آگیا؟ اس نے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھ کے سوچا۔ ابھی تو سارے لوگ گئے تھے جو اس کا دکھ بٹانے اور دل بہلانے کے بہانے ہفتے بھر سے ڈیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ عائشہ ان سب کی ہمدردی کے پردے میں چھپی ہوئی غرض کو پہچانتی تھی۔ وہ ان سب کی نظروں کو دیکھتی رہتی تھی جو اس کے چہرے سے کچے کمرے کی دیواروں تک اور کونوں کھدروں تک ہر جگہ کا ایکس رے کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ عائشہ کو ان سب کی صورتوں پر اور آنکھوں میں ایک ہی سوال نظر آتا تھا۔ پیسہ کہاں ہے عائشہ؟

دوبارہ دستک پر اس نے دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی کلہاڑی کو مضبوطی سے تھام لیا "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو.... میں ہوں۔"

عائشہ آواز کو نہ پہچان سکی "میں کون..... خیریت چاہتے ہو تو

خود دفع ہو جاؤ۔ ورنہ سر پھاڑ دوں گی۔"

"دیکھیں.... میں لاہور سے آیا ہوں" باہر سے آواز آئی "میں نے آپ کو فلموں میں کام کرنے کے لیے بلایا تھا۔ اپنا کارڈ دیا تھا اور دو ہزار..."

عائشہ نے چارپائی گھسیٹ کے دور کی اور دروازہ کھول دیا "تم اس وقت کیوں آئے ہو؟"

وہ عائشہ کے ہاتھ میں کلہاڑی دیکھ کے حیران ہوا "تم کو اتنا پریشان اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے یہاں تم سے ملتے دیکھے اور اس کا غلط مطلب نکالے۔ تم خود مجھ سے ملنے.... مجھ سے بات کرنے آئی تھیں تو بہت محتاط تھیں۔"

عائشہ نے سر ہلایا "کرم داد سے مل کے آئے ہو؟"

"نہیں.... اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی" معاون ہدایت کار نے کہا "دراصل وہ فلم کسی اور نے خرید لی تھی۔ مکمل ہونے سے پہلے ہی اور میں نے سنا ہے اب اس فلم میں کرم داد کام نہیں کرے گا۔"

"پھر وہ کیا کر رہا ہے؟ دوسری فلموں میں کام مل گیا ہوگا اسے۔"

معاون ہدایت کار نے نفی میں سر ہلایا "میرا خیال ہے وہ کہیں چلا گیا ہے۔ کچھ اور کر رہا ہے۔ لاہور میں جو فلمیں بن رہی ہیں اس وقت' ان میں تو کرم داد کو کسی نے نہیں رکھا ہے۔ جو نئی فلمیں فلور پر آئی ہیں' ان کا بھی پتا ہے مجھے۔"

"لیکن ابھی ایک مہینہ پہلے...."

"کوئی چٹھی آئی تھی اس کی...." معاون ہدایت کار نے کہا۔

"نہیں.... پیسے بھیجے تھے اس نے' چالیس ہزار روپے' منی آرڈر سے۔"

معاون ہدایت کار سخت حیران ہوا "چالیس ہزار۔ یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔"

"اس کی وجہ سے گھر میں ڈاکو آ گئے۔ انہوں نے کرم داد کے ابا کو مار دیا اور پیسہ لے گئے۔"

"مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کے" وہ پلنگ کی پٹی پر ٹک گیا "کیا منی آرڈر پر کرم داد نے اپنا پتا نہیں لکھا تھا؟"

"لکھا ہوگا لیکن مجھے پڑھنا نہیں آتا" عائشہ نے تکیے میں ہاتھ ڈال کے کاغذ کا ایک مڑا تڑا پرزہ برآمد کیا "تم دیکھو۔"

معاون ہدایت کار نے کاغذ کھول کے دیکھا۔ "تمہیں معلوم ہے اس پر کیا لکھا ہوا ہے؟ مگر تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ تمہیں پڑھنا ہی نہیں آتا۔"

عائشہ نے غور سے اسے دیکھا "ایسی کیا بات ہے جی؟"

"تمہیں واقعی نہیں معلوم؟ تمہارا ابا بھی ان پڑھ تھا؟" معاون ہدایت کار بولا۔

"وہ میرا نہیں' کرم داد کا ابا تھا۔"

معاون ہدایت کار نے افسوس سے سر ہلایا "اس میں.... کرم داد نے لکھا ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں' تین بار لکھا ہے۔"

عائشہ کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ وہ کھڑے کھڑے کانپنے لگی اور پھر دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئی "تم.... جھوٹ بولتے ہو۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ جس سے چاہو پڑھوا لو۔"

عائشہ لمبے لمبے سانس لینے لگی "مگر.... ابا نے کچھ اور بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا..... کرم داد چاہتا ہے کہ ہم مکان پکا بنوا لیں اور دکان میں سامان ڈال لیں' اسے ڈاکیے نے پڑھ کے سنایا تھا۔ وہ خود اندھا تھا۔"

معاون ہدایت کار کی نظریں عائشہ پر جمی رہیں "آئی ایم سوری۔ ڈاکیے نے مرحوم سے غلط بیانی کی۔ اس میں تو یہ بھی لکھا ہے اس رقم سے عائشہ کا حق مہر ادا کر دیا جائے۔"

"لیکن.... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جو ڈاکیا منی آرڈر لایا تھا' وہ تو بہت خوش تھا اور مبارک بادیں دے رہا تھا۔"

"شاید وہ بری خبر سنانا نہیں چاہتا ہوگا..... اور ممکن ہے اسے اپنے انعام کی محرومی کا ڈر ہو۔ کتنا تھا تمہارا حق مہر...؟"

عائشہ خلا میں گھورتی رہی "اس نے طلاق دے دی مجھے....."

وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد معاون ہدایت کار نے کہا "اب کیا سوچا ہے تم نے...؟"

"اب.... اب سوچنے کو کیا رہ گیا ہے؟" عائشہ نے اپنے آنسو پونچھے۔

"میرا مطلب تھا.... تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں یہی معلوم کرنے آیا تھا..... ایک نئی فلم شروع ہونے والی ہے۔"

عائشہ اٹھ کھڑی ہوئی "دراصل.... وہ کارڈ گم ہو گیا تھا مجھ سے..... جو تم دے کر گئے تھے۔"

"کوئی بات نہیں" معاون ہدایت کار کے لبوں پر ایک عیار مسکراہٹ پھیل گئی "میں خود آ گیا ہوں تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے۔ اگر تم چاہو تو.... میری گاڑی کھڑی ہے.... وہیں...."

"پہلے مجھے کرم داد کو تلاش کرنا ہے۔"

"مگر کیوں.... اس سے اب کیا تعلق ہے تمہارا....." معاون ہدایت کار نے کہا۔

"تعلق تو کوئی نہیں۔ بس میں اس کی امانت اسے لوٹانا چاہتی

## موقع

شوہر "تم نے اس لڑکی کو نوکری سے کیوں الگ کیا؟ ایک موقع تو اور دیا ہوتا۔"

بیوی "موقع! کس کو....؟ اس کو یا آپ کو؟"

عبدالہادی ظہیر الحق نے مردان سے بھیجا

ہوں" اس نے بے خبر سوئے ہوئے بچے کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا۔ وہ کسی فلم میں کام نہیں کررہا ہے.... ہوسکتا ہے وہ تمہیں لاہور میں بھی نہ ملے۔" معاون ہدایت کار نے کہا "میں نے سنا ہے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ جھوٹ سچ کا مجھے علم نہیں۔ وہ لاہور کے ایک فلمساز رانا صاحب کے گھر میں رہتا تھا۔ وہاں اس نے موقع پا کے ڈکیتی کی۔"

"ڈاکا ڈالا... کرم داد نے...؟"

"یہی بات مشہور ہے۔ رانا صاحب نے اس کے خلاف رپورٹ بھی لکھوائی ہے شاید۔ ان کی سیکریٹری کے ساتھ مل کے کرم داد نے یہ واردات کی پھر وہ دونوں فرار ہوگئے۔ وہ ضرور جعلی نام سے نکلے ہوں گے ورنہ معلوم ہوجاتا۔ رانا صاحب نے بڑی مہربانی کی تھی اس کے ساتھ۔ رہنے کو جگہ دی تھی اور ان کی فلم میں بھی کام کررہا تھا۔ بس آگیا لالچ میں یا اس لڑکی کے چکر میں پڑ گیا جو آفس میں ان کی سیکریٹری تھی۔ دونوں غائب ہیں۔ تم چاہو تو رانا صاحب سے مل کے ساری بات معلوم کرلو۔"

"تمہیں سب معلوم تھا...؟"

"ہاں مگر میں نے سوچا.... صدمہ ہوگا تمہیں۔"

"میں چلوں گی تمہارے ساتھ" عائشہ نے کچھ دیر بعد کہا "تم ذرا باہر جاؤ' میں کپڑے بدل لوں۔"

معاون ہدایت کار کے لبوں پر کامیابی کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اٹھا اور باہر صحن کی ویرانی اور تاریکی میں ٹھہر گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالی اور پھر لائٹر سے روشن کی۔ ایک ہفتہ پرانے منی آرڈر فارم کا میلا کچیلا مسلا ہوا ٹکڑا ابھی تک اس کے پاس تھا۔ اس نے کاغذ کے اس پرزے کو لائٹر کے شعلے سے چھوا۔ کاغذ جلنے لگا۔ معاون ہدایت کار نے اس کی سیاہ راکھ کو جوتے سے مسل دیا۔

اندر کپڑے بدلنے کے بہانے عائشہ نے جلدی جلدی چولھے کی اینٹوں کو اکھاڑا۔ اس کے پیچھے مٹی گارے کا پلستر تھا۔ عائشہ نے اسے کھودا اور پلاسٹک میں لپٹے ہوئے ساڑھے انتالیس ہزار روپے نکال لئے۔ یہ رقم اس نے کپڑے کی پٹی میں باندھی اور اس پٹی کو کمر کے گرد لپیٹ لیا پھر وہ سوتے ہوئے کاکے کو گود میں اٹھا کے باہر آگئی۔

"میری گاڑی ادھر ہے" معاون ہدایت کار نے کہا۔

"پہلے مجھے ادھر جانا ہے" عائشہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں کرم داد کی کوئی نشانی اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ اگر کبھی وہ آیا تو اپنی امانت خود سنبھالے گا۔ میرا اپنے ماضی سے اب کوئی رشتہ نہیں۔"

وہ خوابیدہ گاؤں کی ایک گلی سے گزرے۔ عائشہ نے کپڑوں میں لپٹے ہوئے کاکے کو ایک گھر کے دروازے پر لٹا دیا۔ یہ کرم داد کے بھائی کا گھر تھا۔

پھر وہ معاون ہدایت کار کے ساتھ چل پڑی۔ اس کی گاڑی خاموش رات میں سرسراتی ہوئی اس سڑک پر دوڑنے لگی جس پر میٹھی' خوشبودار رس والی خوبانیوں سے لدی شاخوں والے درخت سایہ فگن تھے۔ یہ ٹھنڈے میٹھے پانی کے قدرتی چشمے اور آبشاروں والے سیدپور' اس کے سرسبز کوہساروں اور پہاڑی راستوں سے شہر کی زرپرست ہوسناکیوں' سازشی کثافتوں اور پرہجوم تنہائیوں کی جانب وہی سفر تھا جس پر کرم داد بھی اکیلا گیا تھا اور لوٹ کے نہیں آیا تھا۔ یہ ایک بے عذر شرمساری سے پاک اور پرسکون ماضی سے ندامتوں والے پرعذاب مستقبل کی جانب اکیلے پن کا سفر تھا۔

لیکن یہ سب عائشہ کیسے جان سکتی تھی۔ خواب دیکھنے والی آنکھوں سے وہ صرف خواب ہی دیکھ سکتی تھی۔

○☆○

خواب عائشہ نے بھی دیکھے تھے اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا تب سے دیکھ رہی تھی اور ان سارے خوابوں کو بڑی محبت سے پال رہی تھی۔ ہر خواب کو اس نے اپنی یادوں کے نہاں خانے میں ایسے سجا رکھا تھا جیسے کوئی شوقین مزاج سب دیکھی ہوئی فلموں کے وڈیو کیسٹ اپنی ذاتی لائبریری میں سنبھال کے رکھے اور جمع کرتا جائے۔

عائشہ کے سارے خواب وہی تھے جو ہر عورت دیکھ سکتی ہے اور دیکھتی ہے۔ اس وقت جب وہ ایک بچی ہوتی ہے اور جب ایک لڑکی بن جاتی ہے.... اور اس وقت جب وہ بیوی بنتی ہے اور پھر ماں بنتی ہے لیکن وقت کی گرد میں سارے خواب دھندلا جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ زندگی کے تلخ حقائق سارے خوابوں کو یوں کھا جاتے ہیں جیسے خشک سالی سبزے کو' پھولوں کو' پودوں کو اور درختوں کو کھا جاتی ہے۔

عائشہ خود کو خوش نصیب سمجھتی تھی۔ خدا نے اسے وہ سب دیا تھا جس کی سیدپور میں رہنے والی لڑکیاں آرزو کرتی تھیں۔ ساری لڑکیاں اس سے حسد کرتی تھیں کیونکہ حسن میں کوئی اس کا پاسنگ بھی نہ تھی اور سارے نوجوان اس کو دیکھ کر حسرت سے آہیں بھرتے تھے اور اس کا موازنہ اپنے اپنے طور پر کسی فلمی ہیروئن سے کرتے تھے۔ اس کی ایک نگاہِ غلط انداز اور ایک مسکراہٹ کے انعام کو ترستے تھے اور ایسے بہت تھے جو فرطِ جذبات میں یا جوشِ مردانگی میں اس سے عملاً اظہارِ عشق کی کوشش کرچکے تھے اور عائشہ کے ماموں چاچوں کے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ تاہم عائشہ کے لیے یہ بڑے غرور کی بات تھی کہ سارا گاؤں اس پر مرتا ہے۔ یہ غرور دوسری سب احساسِ کمتری میں مبتلا ہوجانے والی لڑکیوں کو حسد میں مبتلا رکھتا تھا۔

جب وقت آیا تو عائشہ کو خاندانی جبر کے تحت کسی عمر میں دگنے یا بدصورت اور بدکردار مرد سے شادی نہیں کرنی پڑی۔ اس نے کرم داد کو پسند کیا اور اسے کرم داد مل گیا جو خود عائشہ کی طرح گاؤں کی ساری لڑکیوں کا محبوب نظر تھا۔ کرم داد نے شادی کے بعد

بھی اسے اپنی محبوبہ ہی سمجھا۔ گھر کی کھیتی یا پاؤں کی جوتی نہیں۔ جیسا کہ سب مو ہر سمجھتے آئے تھے پھر خدا نے اسے جو بیٹا دیا وہ بالکل تصویروں والا گڈا تھا۔

چنانچہ عائشہ ایسا سمجھتی تھی کہ سارے خواب اس کی دسترس میں ہیں۔ اس کے خوابوں میں ایک چھوٹا سا گھر بھی شامل تھا اور ایک اپنی سواری بھی جس میں بیٹھ کے وہ کرم داد کے ساتھ راولپنڈی شہر میں گھومے۔ سواری کا مطلب تھا ایک موٹر سائیکل۔ یا کم سے کم اپنا تانگا۔ محلوں کے اور عالی شان کاروں کے خواب اس کے خیالوں کی طاقت پرواز سے آگے کی بات تھی۔

ایک فلم ساز کا سید پور آکے کرم داد کو فلم میں کام کی پیشکش کرنا اور دوسرے کا عائشہ کو یقین دلانا کہ وہ بھی ہیروئن بن کے لاکھوں کما سکتی ہے' خوابوں کی نئی دنیا کے دروازے کھولنے کے مترادف تھا۔ اسے یوں لگا جیسے خوش قسمتی نے اسے الہ دین کا جادوئی چراغ تھمادیا ہے۔ اس چراغ کے تابع ایک جن ہے اور وہ دولت کا جن ہے جو ہر خواہش کو چٹکی بجانے میں پورا کرنے پر قادر ہے۔ وہ چاند کو چھو سکتی ہے اور ستاروں پر کمند ڈال سکتی ہے۔ سونے چاندی کے محل' جگ مگ کرتے ہیروں کے نولکھے ہار' لشکارے مارتی کاریں جو زمین پر چلتی ہیں تو لگتا ہے اڑ رہی ہیں۔ وہ اپنے غلام دولت کے جن سے کچھ بھی مانگ سکتی ہے۔ اب اسے خواب دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تعبیر خرید سکتی ہے۔

جب کرم داد نے چالیس ہزار کا منی آرڈر بھیجا تو عائشہ کے لیے شبے کی کوئی بات ہی نہیں رہی کہ سچ مچ انہیں الہ دین کا جادوئی چراغ مل گیا ہے اور دولت کا جن اس کے اشارۂ ابرو کا غلام ہے۔ وہ حکم دے گی اور جن سر جھکا کے کہے گا کہ جو حکم مالکن' اور پلک جھپکتے میں خواہش کا حقیقی روپ سامنے آجائے گا۔

اس کے بعد عائشہ نے اپنے سارے پرانے' ٹوٹے پھوٹے' میلے اور گرد آلود خواب جو پہلے اسے بہت عزیز تھے کوڑے میں پھینک دیے کیونکہ وہ سب اسے مضحکہ خیز حد تک شرمناک محسوس ہونے لگے تھے۔ لاٹری کے انعام سے کروڑپتی بن جانے والے کی طرح جو کسی افلاس زدہ بستی میں اپنے آباؤاجداد کے تنگ و تاریک کوٹھریوں والے گھر سے شفٹ ہو کے کسی ماڈرن سوسائٹی کی کوٹھی میں جاتا ہے تو پرانے وقتوں کی ہر چیز وہیں چھوڑ جاتا ہے۔ پرانا فرنیچر' پرانے برتن' پرانے کپڑے' پرانے لوگ اور پرانے رشتے۔ عائشہ نے بھی نئے ارمانوں کی دنیا میں قدم رکھ دیا تھا۔

مگر پھر اچانک جیسے خواب ختم ہو گیا اور اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ اس سے دیوانگی کی حد تک پیار کرنے والا کرم داد' نہ ان کے پیار کی نشانی وہ بیٹا جو اشتہاروں میں نظر آنے والے بچے سے بھی زیادہ خوب صورت تھا۔ نہ ان کا گھر اور نہ سید پور۔ وہ خالی ہاتھ اور اکیلی ہو گئی تھی اور ایک اجنبی کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھی شہر جا رہی تھی۔

اب اس کا دل کہتا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ کرم داد بتاتا تھا کہ عائشہ' شہر میں اب ہر چیز دو نمبر ملتی ہے۔ اصل کچھ نہیں' مکھن اور گھی..... دودھ اور شہد جیسی چیزیں بھی نقلی ہیں۔ آٹے سے دوائیوں تک سب میں ملاوٹ ہے۔ ہر چیز میں کھوٹ ہے۔ سونے چاندی سے نیت اور پیار تک میں۔ شاید الہ دین کا جادوئی چراغ بھی نقلی تھا۔ اس کے تابع دولت کا کوئی جن نہیں تھا جو اس کی ہر خواہش کو چٹکی بجاتے ہی پوری کر سکے۔

کرم داد اس بات پر سخت ناراض ہوا تھا کہ عائشہ بھی اس کے ساتھ لاہور جانا چاہتی ہے۔ اس سے پوچھے بغیر..... عائشہ نے چوری چھپے ایک اجنبی سے دو ہزار روپے لے لیے تھے اور فلموں میں کام کرنے کی ہامی بھرلی تھی۔ وہ کرم داد کے ساتھ جانا چاہتی تھی اور اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اس طرح وہ بھی شہر پہنچ جائے گی اور دو ہزار کا کیا ہے' اگر کرم داد بہت غصے ہوا تو وہ واپس کردے گی۔ کہہ دے گی کہ میں کیا کروں' میرا شوہر مجھے فلموں میں کام کرنے کی اجازت جو نہیں دیتا اور بات ختم ہو جائے گی۔ کرم داد فلموں میں کام کرتا رہے گا۔ بس ہر جگہ ہر وقت وہ کرم داد کے ساتھ رہے گی۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کتنا کماتا ہے اور کہاں خرچ کرتا ہے۔ حساب کتاب سے زیادہ کرم داد کی نظر پر نظر رکھنا بے حد ضروری تھا۔ مرد کی نظر بڑی جلدی بھٹکتی ہے اور اگر اس کے ساتھ جیب میں مال ہو اور ہر طرف بکاؤ مال ہو تو بیوی سچ مچ گھر کی مرغی ہو جاتی ہے پھر فلم والیاں' گولا گنڈا.....برف جیسے اجلے بدن پر نخروں کے رنگین شربت ڈالے پھرتی ہیں اور پیاسے لپکتے ہیں کہ چاٹ چاٹ کے اندر کی ساری آگ بجھالیں۔

عائشہ اندر سے خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی کیونکہ اس کے ساتھ بھی جو مرد تھا وہ دیکھنے میں بڑا مسکین صورت اور بات چیت میں بڑا جی جناب کرنے والا تھا مگر اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بہرحال مرد تھا اور شہری تھا جو بڑے مکار اور خود غرض ہوتے ہیں پھر وہ اس دنیا سے تعلق رکھتا تھا جہاں انسان نہیں ایکٹر رہتے ہیں۔ روز چہرے بدلنے والے اور اداکاری کے ماہر۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ شریف اور ہمدرد کا رول کرتے کرتے وہ ایک دم بدمعاش اور حیوان بن جائے۔ ہوس کی چمک جسے اس نے دبا رکھا تھا اچانک اسے مغلوب کرلے۔ وہ عائشہ کا پیسہ چھین لے یا اس کی عزت لوٹ لے۔ اس اندھیری رات اور ویران جنگل میں وہ کہیں بھی اپنی گاڑی روک لے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے کہے.....

اس نے کہا "کیا سوچ رہی ہو تم؟"

وہ اچھل پڑی "میں.....کچھ نہیں۔ سوچنا کیا ہے؟"

اس نے مسکرا کے عائشہ کو دیکھا "تم بہت ڈری ہوئی اور پریشان ہو۔"

عائشہ نے اقرار میں سرہلایا "میں پہلی بار اکیلی شہر جا رہی

ہوں۔"

"اکیلی کہاں، میں ہوں تمہارے ساتھ۔" اس نے نرمی سے عائشہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

عائشہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے کرم داد کے خنجر کو محسوس کیا جس کا پھل دھوپ میں چاندی کا بنا ہوا لگتا تھا۔ کرم داد کا ہاتھ بہت صاف تھا۔ ایک بار اس نے اپنے کسی ساتھی پر کلہاڑی سے حملہ کرنے والے کا ہاتھ کلائی پر سے اڑا دیا تھا اور وہ ہاتھ کلہاڑی سمیت فرش پر گر گیا تھا۔ ایک سیکنڈ کی تاخیر ہو جاتی یا وار اوچھا پڑتا تو کلہاڑی کا پھل کرم داد کے دوست کا سر درمیان سے دو ٹکڑے ہو کر دیتا۔ دوسری بار اس نے چاقو پھینک کے مارا تھا اور اس کی نوک ایک پاگل کتے کی گردن میں اتر گئی تھی۔ وہ وہیں پھڑک کے مر گیا تھا۔ قریب جا کے اسے مارنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

عائشہ نے قریب آتی ہوئی راولپنڈی شہر کی روشنیوں کو دیکھا اور سکون کا سانس لیا۔ "ہم کب تک پہنچ جائیں گے لاہور؟"

"دوپہر کے بعد..... کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔ ہم راولپنڈی میں تھوڑی دیر ٹھہریں گے، ناشتے کے لیے" اس نے خوش گوار لہجے میں گفتگو سے عائشہ کی اداسی کم کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ کاکا یاد آرہا ہے مجھے۔"

"کون کاکا؟"

"میرا بیٹا۔ پتا نہیں اسے کسی نے اٹھایا بھی ہو گا یا وہ ابھی تک وہیں لیٹا رو رہا ہو گا۔ سب سو رہے ہوں گے۔ اس کے چلانے کی آواز کون سنے گا، بھوکا ہو گا وہ" عائشہ رونے کے قریب ہو گئی "اسے میں ساتھ ہی لے آتی تو اچھا تھا۔"

معاون ہدایت کار نے سپاٹ لہجے میں کہا "نہیں عائشہ۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اسے چھوڑ دیا۔ کسی کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ تم ایک ماں ہو۔ فلموں کی ہیروئن کو لوگ ماں کے روپ میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ ایک لڑکی ہوتی ہے۔ خواہ اس کی عمر انجمن کے برابر ہو جائے یا بابرا شریف جتنی۔ وہ لڑکی ہی رہتی ہے۔ ایسی لڑکی جس پر فلم دیکھنے والے بچے، بوڑھے نوجوان سب مرتے ہیں۔ اس کے عشق میں آہیں بھرتے ہیں اور اس کی تصویر کو سینے سے لگا کے سوتے ہیں کہ..... نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی اور اس سے شادی کے آرزو مند تو اسکول کالج کے لڑکوں سے ادھیڑ عمر لوگ تک ہوتے ہیں۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

عائشہ خاموش بیٹھی ونڈ اسکرین کے پار اندھیرے میں اپنے مستقبل کو اندیشوں کی پرچھائیوں میں دیکھنے کی فضول کوشش کرتی رہی۔

"..... کہنے کا مطلب یہ تھا..... کہ جو ایک بچے کی ماں ہو..... اور بیوی ہو کسی کی..... اس کے لیے پرستاروں کے یہ جذبات کیسے ہو سکتے ہیں۔ دیکھ لو یہ جو سب بڑی بڑی اسٹارز ہیں، انہوں نے شادی کی تو فلم کا کیریئر ختم پھر وہ گھر میں بیوی بن کے بیٹھ گئیں۔ زیبا، صبیحہ، مسرت نذیر، نیلو اور بھارت میں سائرہ بانو۔ ہیما مالنی، رینارائے..... سیکڑوں مثالیں ہیں۔"

جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ عائشہ اس کو دیکھتی رہی "اور کرم داد..... جس کی شادی ہوئی تھی مجھ سے..... کیا وہ بھی کہے گا کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ عائشہ میری گھر والی نہیں تھی۔"

معاون ہدایت کار نے کہا "دیکھو..... تم ایک نیا چہرہ ہو فلمی دنیا میں، جسے میں متعارف کرا رہا ہوں۔ تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو؟ تمہارا اصل نام کیا ہے۔ یہ سب کسی کو معلوم نہیں..... اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ شہر میں اخبار والے بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ بال کی کھال نکالتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ رائی کا پہاڑ بنا دیں۔ تمہاری زبان سے ایک غلط لفظ یا جملہ نکل جائے تو اس کو اپنے مطلب میں ڈھال کے ایک سنسنی خیز سرخی بنا دیں۔ اسکینڈل کھڑا کر دیں۔ تم ابھی ان الفاظ کا مطلب بھی نہیں سمجھوگی مگر کچھ عرصے بعد سب جان لوگی۔ میں تمہیں پریشانی اور بدنامی سے بچانا چاہتا ہوں۔ فلموں میں میری اور تمہاری دونوں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار بہت سی باتوں پر ہے۔ تم نووارد ہو لیکن میں نے فلم نگری میں اٹھارہ سال گزارے ہیں۔ میرے تجربے پر بھروسا رکھو۔ میں بھلائی چاہتا ہوں تمہاری۔"

"کیوں؟" عائشہ نے بے خیالی میں کہا "میری بھلائی کیوں چاہتے ہو تم؟"

معاون ہدایت کار جھلّا کے بولا "اس لیے کہ اسی میں میری بھلائی ہے۔ بس جیسا میں کہوں ایسا ہی کرو۔ کس سے ملنا ہے اور کس سے نہیں ملنا ہے۔ کس سے بات کرنی ہے اور کیا بات کرنی ہے؟ یہ سب میں بتاتا رہوں گا تمہیں۔ کسی کو ہیروئن کو بنانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ بہت محنت ہوتی ہے اس میں، بہت پیسہ خرچ ہوتا ہے اور کامیابی کی کوئی گارنٹی نہیں۔ یہاں ہر قدم پر تمہیں ایسے لوگ ملیں گے جو تمہیں لالچ دیں گے۔ جھوٹے، دغاباز، مکار لوگ۔ جو تمہیں سبز باغ دکھائیں گے۔ لمبے چوڑے وعدے کریں گے اور معاہدے کریں گے مگر وہ تم سے سب کچھ چھین لیں گے اور تمہیں کچھ بھی نہیں دیں گے۔ تم دربدر ہو کے گمنامی اور رسوائی کے اندھیرے میں گم ہو جاؤ گی۔ ہر سال ہیروئن بننے کے لیے لاہور آنے والی سیکڑوں ہزاروں لڑکیوں کی طرح..... میری بات کو غور سے سنو، سمجھو اور گرہ میں باندھ لو۔ کسی کے بہکائے میں مت آنا، کسی کے وعدے پر اعتبار مت کرنا۔ لوگ تمہیں مجھ سے بھی بدظن کریں گے تاکہ تم بے سہارا اور لاوارث ہو جاؤ۔ وہ سب بھیڑیے ہوں گے جو ایک معصوم بھیڑ کو گھیرنا چاہتے ہیں۔"

"کرم داد میری حفاظت کر سکتا ہے۔"

"اف..... لعنت بھیجو کرم داد پر۔ بھول جاؤ کرم داد کو۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ تمہیں لاہور آ کر بھول گیا۔" معاون ہدایت کار

نے خفگی سے کہا "تم اب عائشہ زوجہ کرم داد نہیں ہو۔ تمہارا ایک فلمی نام ہوگا۔ جو لوگوں کو اچھا لگے اور ان کی زبان پر آجائے مثلاً نیلم...یا مہ پارہ...یا گلناز۔ مجھے گلناز سب سے بہتر لگتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ قبل از وقت کسی کو بھی کچھ معلوم ہو کہ میری آنے والی فلم کی نئی ہیروئن کون ہے۔"

عائشہ کے حلق میں کچھ اٹک گیا "لیکن... کرم داد...؟"

"لاحول ولا قوۃ پھر وہی کرم داد...... بھاڑ میں گیا کرم داد۔ اب تمہارا اس سے رشتہ ہی کیا ہے..... اور کیا پتا کہ وہ زندہ ہے کہ مرگیا....." معاون ہدایت کار نے غصے سے کہا۔

"ایسا مت کہو....." عائشہ چلائی اور ایک دم اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا "وہ زندہ ہے.....وہ اپنی عائشہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تلاش کرلوں گی اسے..." وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

معاون ہدایت کار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے سچ کے کڑوے پیالے کا سارا زہر ایک ساتھ عائشہ کے حلق میں انڈیل دیا تھا۔ اسے یہ کام آہستہ آہستہ کرنا چاہیے تھا۔ سچ چھپایا نہیں جاسکتا نہ بدلا جاسکتا تھا۔ اسے بالآخر عیاں ہونا تھا اور اپنے وجود کی ساری کڑواہٹ کے ساتھ عائشہ سے تسلیم کرانا تھا لیکن اس سے پہلے ضروری تھا کہ عائشہ میں قوتِ برداشت پیدا کی جائے۔ اسے تھوڑا تھوڑا سچ معلوم ہوتا تو وہ اس کی تلخی کو قبول کرنے کی عادی ہوجاتی۔ تلخ حقیقت کو منافقت اور فریب کی مٹھاس چڑھی گولی بنانا مشکل نہیں تھا۔ پہلے سچ کی کڑواہٹ کا صرف ایک قطرہ.... پھر ایک چمچہ..... اس کے بعد ایک گھونٹ اور اس کے بعد..... اس کے بعد وہ ایک تلخ جام خود اٹھالیتی۔

اس نے بلاتوقف اپنی حماقت پر ریاکاری کا پردہ ڈال دیا۔

"ارے یہ کیا، تم رو رہی ہو۔ بھئی حد کردی تم نے بھی۔ اتنی کم ہمت ہو تم، مجھے معلوم نہیں تھا۔ میری بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا.....وہ تو بس ایک بات میرے منہ سے نکل گئی غصے میں۔ بلڈ پریشر کا مریض ہوں میں۔ الفاظ پر مت جاؤ، خدانخواستہ کرم داد کی زندگی کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔ وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ میں اسے تلاش کرنے میں تمہاری مدد کروں گا۔ پریشان ہونے کی قطعی کوئی بات نہیں..... خدا کے لیے یہ آنسو پونچھ ڈالو ورنہ میں مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں تمہیں اغوا کرکے لایا ہوں.....یا طلاق کی دھمکی دے رہا ہوں۔"

عائشہ اس مذاق سے لطف اندوز نہیں ہوئی مگر آہستہ آہستہ اس نے اپنی ہچکیوں پر قابو پالیا۔ کچھ دیر بعد وہ خاموش ہوگئی اور خالی خالی نظروں سے اس سڑک کو دیکھتی رہی جو کار کے نیچے سے پھسلتی جارہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ اس کے ماضی کی ڈور ہے جو اس کے قبضۂ اختیار سے نکلتی جارہی ہے۔ سید پور پیچھے ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر رہ گیا تھا مگر اب شاید واپسی ناممکن ہوگئی تھی۔

ابھی صبح کے آٹھ بجے تھے، سڑک پر بسوں اور کاروں میں ریس سی لگی ہوئی تھی۔ سب ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ صرف عائشہ تھی جو ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک بے وجود لمحے میں رکی ہوئی تھی اور بے یقینی کے خلا میں بھٹک رہی تھی۔ وقت جو گزر گیا تھا اس سے تعلق کے سارے رشتے توڑ چکا تھا اور جو آنے والا تھا اس کے لیے ایک بے چہرہ اجنبی کی طرح تھا۔ وہ مجبور تھی کہ خود پر اپنے اعتبار سے محرومی کی سزا کو قبول کرے۔ وہ یہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ اپنی عقل پر حد سے زیادہ بھروسا کرتے ہوئے اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ کس حد تک صحیح یا غلط تھا۔

معاون ہدایت کار ایک ذہین آدمی تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ فلمی دنیا کے عملی مسائل اور پس پردہ حالات کے بارے میں کرم داد یا اس کی بیوی عائشہ کی معلومات اتنی ہی تھیں جتنی سید پور جیسے گاؤں میں رہنے والے کسی کنوئیں کے مینڈک کی ہوسکتی تھیں۔ انہوں نے فلمیں بھی دیکھی تھیں اور فلموں کی شوٹنگ ہوتے بھی دیکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر خوب صورت لڑکی ہیروئن بن کے انجمن کی طرح عزت، دولت اور شہرت سب کما سکتی ہے اور ہر نوجوان ہیرو بن سکتا ہے اگر اسے چانس مل جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایم اے پاس مرد یا عورت دونوں کالج میں پڑھا سکتے ہیں اگر نوکری مل جائے۔ چانس انہیں تقدیر نے گھر بیٹھے فراہم کردیا تھا تو جیسے پروفیسر کو تنخواہ ملتی ہے ایسے ہی انہیں اداکاری کا معاوضہ ہزاروں لاکھوں میں مل جائے گا اور ملتا رہے گا۔ مسٹر کرم داد اور مسز کرم داد اپنے کاکے کے ساتھ زندگی کے دن ہنسی خوشی گزار دیں گے۔ کوٹھی میں عیش کرتے، کاروں میں گھومتے، دولت میں کھیلتے۔

ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہوئے معاون ہدایت کار نے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بلاشبہ عائشہ کا چہرہ فوٹو جینک تھا اور وہ تعلیم یافتہ نہ سہی، ذہین تھی۔ اس میں خوداعتمادی تھی اور اگر وہ اداکاری کے ساتھ رقص بھی سیکھ لیتی تو فلمی صنعت میں ایک طوفان بپا کرسکتی تھی مگر اس ایک "اگر" کے ساتھ دوسرے بہت سے "اگر" تھے۔ اگر وہ "اسکرین ٹیسٹ" پاس کرلیتی۔ جو کیمرا مین سے رائٹر اور پروڈیوسر سے ڈائریکٹر تک کوئی کہیں بھی اور کسی بھی وقت لے سکتا تھا۔ اگر اسے اچھا رول مل جاتا۔ اگر وہ اپنی اداکاری یا رقص سے دیکھنے والوں کو متاثر کرسکتی۔ اگر کچھ بھی نہ سہی تو جو کچھ قدرت نے اسے عطا کیا تھا اس کی نمائش سے وہ نگاہوں کو خیرہ کرسکتی۔ اگر اس کی پہلی فلم کامیاب ہوجاتی پھر اگر تقدیر اس پر مہربان ہوجاتی.....اگر...

بظاہر سید پور کی عائشہ کسی "اگر" کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھی مگر ایسا سب کے ساتھ ہوتا تھا۔ فلمی دنیا میں ہیروئن بننے اور لاکھوں کمانے کی آرزو کے ساتھ قدم رکھنے والی ہر لڑکی بالآخر سمجھ لیتی تھی کہ سارے "اگر مگر" کے مرحلے طے ہوجائیں تب بھی

کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے تدبیر نہیں' تقدیر ہی کام آتی ہے جو کسی کے بس میں نہیں۔ چنانچہ ہزار میں سے نو سو ننانوے کچھ پانے کے بجائے سب کچھ گنوا کے ناکامی کو کسی نہ کسی صورت میں قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ واپسی کی صورت میں' ایکسٹرا گرل کی صورت میں' کوٹھے کی صورت میں یا کال گرل کی صورت میں۔

کرم داد اسی خوش فہمی کے دامِ ہمرنگ زمیں کا شکار ہو کے مارا گیا تھا۔ اب عائشہ یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ ہیروئن بھی بن سکتی ہے۔ کرم داد کی وفادار بیوی بھی رہ سکتی ہے اور کاکے کی ماں بھی۔ وقت خود اسے سمجھا دے گا کہ جب وہ ہیروئن ہوگی تو وہ عائشہ نہیں ہوگی۔ وہ پبلک پراپرٹی ہوگی۔ اسے شہرت کے ساتھ عزت ملے گی مگر وہ عزت نہیں جس کی خاطر آج وہ جان بھی دے سکتی ہے۔ اسے دولت ملے گی مگر وہ خود دولت کی قوتِ خرید میں ہوگی۔ اس پر' اس کے جسم پر' اس کے روز و شب کے ہر لمحے پر خریداروں کا تصرف ہوگا۔ جب جھکا تو غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن۔

معاون ہدایت کار جانتا تھا کہ ایک ناتجربہ کار اور کم فہم لیکن حسین اور AMBITIOUS عورت کی عادت اور نظرت' سوچ اور مزاج کو ایک سو اسی درجے گھما کر الٹنے کے لیے کون سی جادوئی چھڑی کام آئے گی۔ کرم داد اور بھولا کیا چیز ہیں' وہ عائشہ کو بھلا دے گی۔

اس نے گاڑی کو جہلم کے ایک اچھے ہوٹل کے سامنے روک لیا "ہم یہاں تھوڑی دیر رک کے ناشتا کریں گے۔"

عائشہ نے بے دلی سے کہا "مگر مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کم آن۔ ہاتھ منہ دھو کے ذرا فریش اپ ہو جاؤ۔ بھوک بھی لگ جائے گی اور دیکھو' تم ایک فلمی ہیروئن بننے جا رہی ہو۔ ذرا پراعتماد نظر آؤ۔ اتنے حسین چہرے پر یہ اداسی نہیں' وہ مسکراہٹ ہونی چاہیے جو ابھی سے دلوں کو گھائل کر دے۔ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔"

عائشہ کا رنگ بدلا "کیا میں واقعی ایسی ہوں؟"

معاون ہدایت کار کا تیر نشانے پر لگا تھا "ابھی تم دیکھنا' تمہارے اندر قدم رکھتے ہی سب پر کیسی بجلی گرتی ہے۔ پتھر کے ہو جائیں گے جو پلٹ کر دیکھیں گے۔"

عائشہ ہال میں داخل ہوئی تو بہت سی نظریں اس کی طرف اٹھیں اور عائشہ نے تپتے رخساروں کے ساتھ محسوس کیا کہ معاون ہدایت کار نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ دیکھنے والے واقعی دیکھتے رہ گئے تھے۔ عائشہ کے حسن و شباب کا تاثر اپنی جگہ لیکن زیادہ لوگ اس جوڑی کے فرق پر کچھ حیران تھے۔ معاون ہدایت کار کی عمر چالیس سال سے زائد تھی اور وہ بہترین سوٹ اور ٹائی میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک غریب دیہاتی قسم کی لڑکی تھی جس نے معمولی ریشمی پرنٹ کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی اور وہ بہت شرمائی گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ نہ اس شخص کی بیٹی یا بیوی ہو سکتی تھی۔ نہ محبوبہ اور سیکریٹری۔

معاون ہدایت کار نے کہا "مت دیکھو کسی کی طرف۔ اب تمہیں عادی ہونا پڑے گا۔ ہر جگہ ندیدے لوگ اسی طرح تمہیں گھور گھور کے دیکھیں گے۔"

عائشہ واش روم سے ہاتھ منہ دھو کے آئی تو اسے اپنی میز تک پہنچنا مشکل ہو گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کے اس نے ایک گہری سانس لی "بس جلدی چلو یہاں سے ناشتا کر کے۔"

معاون ہدایت کار مسکرایا "آرام سے بیٹھو۔ بے خوف ہو کے کوئی بات کرو۔"

"کیا بات کروں؟"

"چلو یہ بتاؤ.... تم کیا معاوضہ لوگی پہلی فلم میں کام کرنے کا؟"

عائشہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی "میں.... میں کیا بتاؤں' تم نے دو ہزار دیے تھے مجھے۔"

وہ ہنسنے لگا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ کرم داد کو ایک فلم میں کام کرنے کے کتنے پیسے ملے تھے..... پچاس ہزار۔"

عائشہ کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ خوشی کی چمک پیدا ہوئی "جب ہی اس نے چالیس ہزار مجھے بھیجے تھے۔ مگر اس کے بعد وہ کہاں چلا گیا؟"

معاون ہدایت کار نے عیاری سے کام لیا "یہ ہو سکتا ہے کہ وہ باہر چلا گیا ہو۔ کسی فلم یونٹ کے ساتھ۔ فلموں کی شوٹنگ کے لیے کسی لوکیشن پر' جیسے سید پور ہے' ایسی ہی بہت سی جگہیں پورے پاکستان میں ہیں۔ مری یا نتھیا گلی' کاغان اور سوات۔ ویسے ملک سے باہر بھی فلموں کی شوٹنگ کے لیے جانا پڑتا ہے۔ لندن' پیرس یا تھائی لینڈ اور سری لنکا۔ سیکڑوں مقامات ہیں۔"

عائشہ کچھ پرسکون انداز میں مسکرائی "کیا مجھے بھی اتنے ہی پیسے ملیں گے؟"

"تمہیں..... سچ بتاؤں گلناز۔ ہیروئن کا معاوضہ ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"بھئی اس لیے کہ اداکاری تو خیر سب کر لیتے ہیں مگر خوب صورتی جو ہوش اڑا دے اور جوانی جو پاگل کر دے' وہ صرف ہیروئن کے پاس ہوتی ہے۔ فلم ہیرو کے نہیں ہیروئن کے ڈانس پر چلتی ہے۔ جو جذبات میں آگ لگا دے ایسا ڈانس۔"

عائشہ کے چہرے پر لالی آ گئی "مگر.... مجھے.... ایسا ڈانس نہیں آتا۔"

"آ جائے گا گلناز۔ سب آ جائے گا۔ سیکھنے سے آتا ہے سب کچھ۔ میں اپنی پہلی فلم میں تم کو ایسے پیش کروں گا کہ سمجھ لو..... قیامت آ جائے گی۔ نیندیں حرام ہو جائیں گی دیکھنے والوں کی اور میں نے طے کیا ہے کہ اس کا معاوضہ تمہیں پورے ایک لاکھ دوں گا۔ ہاں.... میں ان بے ایمان پروڈیوسروں کی طرح نہیں ہوں جو استحصال کرتے ہیں نئی لڑکیوں کا... میرا مطلب ہے ان کی ناواقفیت

سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دس بیس ہزار دے کر احسان کرتے ہیں کہ انہیں موقع دے رہے ہیں۔ بعد میں تو لائن لگ جاتی ہے فلسازوں کی۔ ایک کے دو اور دو کے تین لاکھ دینے والے چکر لگاتے رہتے ہیں۔"

عائشہ سانس روکے پلکیں جھپکائے بغیر سب کچھ سن رہی تھی اور تصور میں ایک لاکھ۔ دو لاکھ اور تین لاکھ روپے دیکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ چالیس ہزار اکٹھے دیکھنے سے پہلے اس نے سات ہزار دیکھے تھے۔ ایک لاکھ میں تو سو نوٹ ہزار ہزار کے ہوتے ہیں۔ دو لاکھ میں دو سو نوٹ ہزار ہزار کے..... اور تین لاکھ میں تین سو نوٹ۔ سو سو کے ہوں تو کتنے ہوں گے..... تین ہزار..... اور دس دس کے..... عائشہ کا دماغ گھوم گیا۔

معاون ہدایت کار نے محسوس کیا کہ جادو کی چھڑی اپنا کام کرگئی ہے۔ اس نے لوہے کو گرم دیکھا اور صحیح وقت پر آخری چوٹ ماری "معاہدہ تم سے بعد میں ہوتا رہے گا۔ تمہیں لاہور پہنچ کے پیسے کی ضرورت پڑے گی گلناز۔ یہ ایڈوانس رکھ لو اپنے پاس۔ نصف رقم ہے' پورے پچاس ہزار..."

عائشہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے درمیان میں رکھی ہوئی نوٹوں کی گڈی کو دیکھا "پچاس..... پچاس ہزار..... یہ کس لیے..."

"بھئی تمہاری ضروریات کے لیے گلناز۔ باقی رقم فلم پوری ہونے کے بعد ... اور ہاں' اس کے علاوہ تمہاری رہائش کے لیے کوٹھی..... نوکر چاکر' کوٹھی کے اندر ضرورت کی ہر چیز' تمہارے لیے نئے کپڑے اور جوتے۔ یہ سب فراہم کرنا فلساز کی ذمے داری ہوتی ہے۔ لاہور پہنچ کے میں سب انتظام کردوں گا۔ ابھی یہی گاڑی رہے گی تمہارے پاس..... میرا ڈرائیور بھی ہوگا۔ میں گزارہ کرلوں گا۔ دوسری گاڑی ہے میرے پاس..... بعد میں تو تم اپنی گاڑی خرید ہی لوگی۔ کوئی عالی شان محل جیسی کوٹھی بھی ہوگی۔ اس وقت تم ہمیں کہاں گھاس ڈالوگی جب بڑے بڑے فلساز اور ہدایت کار تمہارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے....." وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

عائشہ کا ہاتھ کسی ہپناٹائز ہوجانے والے شخص کی طرح آگے بڑھا۔ نوٹوں کی گڈی سے ایک عجیب سی قوت خارج ہورہی تھی جس کے خلاف مزاحمت ناممکن ہوگئی تھی۔ عائشہ کا ہاتھ لوہے کا تھا اور وہ گڈی ایک زبردست مقناطیس بن گئی تھی۔

"مگر آج کی رات میں کہاں رہوں گی؟" عائشہ نے کہا "لاہور میں کوئی نہیں ہے میرا۔"

کامیابی کا نشہ معاون ہدایت کار کے لہجے میں' اس کی مسکراہٹ میں اور اس کی آنکھوں میں اتر آیا "بھئی ہم تمہارے ہیں گلناز۔ رات کی فکر چھوڑو۔ رات کا کیا ہے' جہاں بھی گزرے گی..... اچھی ہی گزرے گی۔ آؤ اب چلیں۔"

○☆○

دروازے پر دستک سن کے گلناز نے ناگواری سے سر اٹھایا "کیا مصیبت ہے؟"

موسیٰ نے اندر آکے کہا "بیٹا' وہ آئے ہیں۔ سیف الدین صاحب!"

گلناز نے جھلا کے کہا "موسیٰ۔ کب عقل آئے گی تمہیں۔ تم نے کہا نہیں کہ وہ تھکی ہوئی ہیں۔ ابھی شوٹنگ سے آکے سوئی ہیں۔"

موسیٰ کا چہرہ اتر گیا "لو بیٹا۔ وہ تو کہتے ہیں کہ خود تم نے انہیں فون کرکے بلایا تھا۔"

گلناز اٹھ بیٹھی "اوہ..... میں واقعی بھول گئی تھی۔ سیفو سے کہو کہ میں ابھی آتی ہوں تیار ہوکے۔"

موسیٰ نے جاتے جاتے کہا "کپڑے تو پہن لیا کرو..... گھر ہے تو کیا ہوا....."

"کپڑے....." گلناز نے تلخی سے کہا "کپڑوں سے کیا ہوتا ہے؟ کیا گھر میں اور کیا باہر..... کس کو اچھے لگتے ہیں میرے بدن پر کپڑے..... اور دیکھو' ابھی ایک گھنٹا انتظار کرنے دو اس الّو کے پٹھے کو۔ چائے ٹھنڈا کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ برا مانتا ہے تو مانے اور جلدی ہے تو جائے۔"

وہ پھر اوندھی لیٹ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ چوہدری صاحب کی بے تابی بالآخر انہیں اس کے سنگِ در پر سجدہ ریز کرادے گی۔ اپنے حلقۂ انتخاب کے بے تاج بادشاہ۔ سیکڑوں مزارعین کے ان داتا' جدی پشتی جاگیر کی رعایا کے ساتھ غلاموں سے بدتر سلوک روا رکھنے والے۔ ان کی جانوں کو حشرات الارض کی طرح روندنے والے اور ان کے گھر کی بہو بیٹیوں کی عزت پامال کرنا اپنی خاندانی روایات کے مطابق اپنا جائز حق سمجھنے والے یہ چوہدری' ملک اور وڈیرے فلمی دنیا میں بھی کم نہ تھے۔ یہاں وہ فلمیں بنانے کے بہانے اپنے ذوقِ حسن کی تسکین سے زیادہ اپنی قوتِ خرید کا غرور حاصل کرتے تھے۔ اس شکار گاہ میں وہ اسی شان سے آتے تھے جیسے پرانے رئیس تیتر بٹیر اور خرگوش مارنے کے کھیل سے اکتا جاتے تھے تو سنسنی حاصل کرنے کے لیے ان جنگلوں کا رخ کرتے تھے جہاں وہ شیر چیتے شکار کرسکیں۔ وہ مرے ہوئے شیر کی لاش پر بندوق کے ساتھ ایک پاؤں رکھ کے تصویر بنواتے تھے۔ ان کے سروں کو حنوط کی طرح ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سجاتے تھے اور کھال کو فرش پر بچھا کے مونچھوں کو تاؤ دیتے تھے کہ انسان کیا چیز ہے' ان کی طاقت کے سامنے جنگل کے بادشاہ کی اوقات کچھ نہیں۔

اب شیر نہیں رہے تھے اور جنگل بھی نہیں تھے مگر شکار گاہیں بہت تھیں۔ بازار میں کوٹھے پر بیٹھنے والی سے کوٹھی میں رہنے والی تک اور لالی وڈ سے بالی وڈ اور ہالی وڈ تک ہر آدمی کی ہمت' طاقت اور استطاعت کو چیلنج کرنے اور دعوتِ تسخیر دینے کے لیے شکار موجود تھا اور خود کو بڑا شکاری سمجھنے والے آج بھی تصویریں بنواتے

تھے اور اپنی فتوحات کی تشہیر کرتے تھے' اسی میں ان کی شان تھی۔
یہ خاندانی لوگ وضع داری کی روایات کے مطابق کسی عم زاد قسم کی بیوی کو خاندانی حویلی میں حکومت کرنے کے لیے اور جاگیر کے وارث پیدا کرنے کے لیے بڑی عزت اور عیش و آرام کے ساتھ رکھتے تھے لیکن مرد کی حیثیت سے اپنے باقی شوق باہر پورے کرتے تھے۔ شوق کی کوئی سمت اور کوئی انتہا نہیں ہوسکتی تھی۔ کاروبار' سیاست' بزم آرائی' اچھی سے اچھی کوٹھی اور کار کی طرح پسند کی ہر چیز۔ اعلیٰ نسل کی گھوڑی' قیمتی شراب' خوب صورت عورت۔ یہ سب ان کے شوق تھے۔
چوہدری سیف الدین جیسے رئیس زادوں کے شوق کی پرواز کے افق محدود تھے۔ وہ قومی طالع آزما تھے۔ بین الاقوامی سطح پر عدنان خشوگی یا ہیڈرزنر اور مرادوک جیسے لوگ اگر شیر تھے تو یہ ان کے مقابلے میں گلی کے کتے تھے۔ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ وہ اس محاورے کو سچ ثابت کرتے تھے۔
کوٹھے پر جانا تو اس کی شان کے خلاف تھا۔ کبھی کوئی چیز پسند آجاتی تھی تو لاکھ دو لاکھ میں وہ کسی مصاحب کے ذریعے گھر پر منگوالیتا تھا مگر ہائی سوسائٹی میں رونق کہلانے کے لیے اسے ہر بولیسٹ پر دس بیس لاکھ بھی خرچ کرنے پڑجاتے تھے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں طبقۂ اشرافیہ کی نمائندگی کرنے والی کسی گرل فرینڈ کے ساتھ تمام آدابِ عاشقی کو ملحوظ رکھنا لازمی تھا۔ تحفے تحائف اور نذرانوں کے ساتھ بعض اوقات منزلِ مراد تک رسائی کے لیے مری یا کراچی ہی نہیں لندن یا پیرس کے بازاروں میں شاپنگ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام بھی ناگزیر ہوجاتا تھا لیکن اس شوق کی آخری منزل کوئی سپراسٹار ہیروئن تھی۔
چوہدری سیف کے مراسم کئی فلمی ہیروئنوں کے ساتھ رہے تھے۔ ان سب کا ریکارڈ اسکینڈل کی چیز خبروں کی صورت میں موجود تھا۔ "متبرا اور خیر" قسم کے فلمی اخبارات و رسائل کے صفحات پر ایسی خبریں خود سیف کے زرِ خرید فلمی صحافی شائع کراتے تھے جس میں اس کے نام کے ساتھ کسی اداکارہ کا نام آتا۔ ان کے مراسم کی خبر ہوتی۔ منگنی یا شادی کی افواہ کے گرم ہونے کا تذکرہ ہوتا اور اگر اداکارہ کی اجازت ہوتی تو بھوربن یا سوات میں ان کے ایک ساتھ نظر آنے کا قصہ مع تصویری ثبوت نظر آتے۔
صفِ اوّل کی ایک اداکارہ کے ساتھ اس کی شادی سال بھر چلی تھی۔ اس سے معاشقے' منگنی اور نکاح کی سب خبریں' تائید اور تردید کے سب بیانات اخباروں کی زینت بنتے تھے۔ اداکارہ نے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ سال بھر وہ غائب رہی تھی پھر ان کے اختلافات کی خبریں آنے لگی تھیں اور بالآخر طلاق ہوگئی تھی۔ اداکارہ اپنی نامکمل رہ جانے والی فلموں کی تکمیل کے لیے واپس آگئی تھی اور اب پھر مصروف تھی۔ اسٹیج کی تین آرٹسٹوں کے ساتھ بھی اسکینڈل مشہور ہوئے تھے مگر کسی کے ساتھ شادی کی نوبت نہیں آئی تھی۔
آج کل چوہدری سیف الدین کی اس پر نظر تھی۔ گلناز خود اس کے لیے ایک چیلنج بننا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگی۔ خود کو شیر کا شکاری سمجھنے والا سیف بڑی تیاری سے آئے گا۔ یہ سمجھ کر آئے گا کہ اس کے مقابل جو عورت ہے وہ کسی طرح بھی آدم خور شیرنی سے کم نہیں۔ وہ گلناز کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہوگا مگر اسے ناز ہوگا اپنی دولت کی بندوق پر اور اپنی مردانہ شخصیت کے جال پر اور اپنے تجربے پر۔
گلناز بظاہر شکار ہونے کے لیے تیار تھی مگر وہ بہت محتاط تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شکار ہونے سے پہلے شکاری کو اتنا زچ کرے۔ اتنا دوڑائے' اتنا حیران کرے اور اتنا مجبور و بے بس کردے کہ اس کی فتح خود اپنی نظر میں ایک شکست بن جائے۔ وہ محسوس کرے کہ شکار وہ خود ہوا ہے۔
ایک گھنٹے اسے انتظار کرانے کا مقصد بھی اسے احساسِ ذلت کی اذیت میں مبتلا رکھنا تھا۔ یہ احساس دلانا تھا کہ یہاں اس کی چوہدراہٹ دو کوڑی کی بھی نہیں اور اس کی حیثیت خیرات یا امداد کے نام پر قرض مانگنے والے دور کے غریب رشتے دار جتنی بھی نہیں ہے۔
جب بالآخر وہ حسن کی سادگی و پرکاری کا انداز لیے ڈرائنگ روم میں پہنچی تو چوہدری سیف الدین اپنی زخم خوردہ انا کے ساتھ بے بسی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ اس کے ضبط کا پیمانہ ایک دم چھلک گیا۔
"آپ نے تو حد کردی جی" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔
گلناز نے اپنی سرد مہر... بے اعتنائی کے ساتھ 'صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا لباس سنبھالا اور سیف سے اتنے فاصلے پر بیٹھ گئی جہاں سے وہ اس کی آتشِ شباب کی حدت کو بھی محسوس کرسکے اور پروانہ وار جل جانے کی آرزو اسے بے قرار رکھے۔
"آپ کب آئے؟" گلناز نے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا۔
"کیا؟ اس بڑھیا نے بتایا نہیں آپ کو...؟"
"بڑھیا؟" گلناز نے ناگواری سے کہا "اس گھر میں ایک ہی ضعیف خاتون ہیں اور وہ میری والدہ ہیں۔"
سیف بوکھلا گیا "وہ.... میرا مطلب تھا... آئی ایم سوری۔"
"انہوں نے بتایا تھا مجھے.... لیکن میں نے دھیان سے سنا نہیں کہ کون آیا بیٹھا ہے۔ ہاں.... انہوں نے کہا تھا کہ چوہدری صاحب آئے بیٹھے ہیں۔"
"پھر بھی آپ کو یاد نہیں آیا....." سیف بولا۔
"بھئی چوہدری تو پتا نہیں کتنے آتے ہیں یہاں اور میں اس وقت دیکھ رہی تھی ٹی وی پر ایک بڑی دلچسپ فلم۔"

"اس نے... انہوں نے تو کہا تھا کہ آپ شوٹنگ سے آئی ہیں اور تھکی ہوئی ہیں۔ نہارہی ہیں" سیف نے کہا۔

"آج تو کوئی شوٹنگ نہیں تھی میری..." گلناز نے اس کی بات کاٹ دی "پھر میں بھول گئی۔"

سیف نے خود کو مزید بے عزت محسوس کیا "آپ یہ بھول گئیں کہ آج آپ نے ہی مجھے بلایا تھا؟"

گلناز نے سرہلایا "دراصل وہ میری سیکریٹری... الّو کی پٹھی' وہ مجھے یاد دلانا بھول گئی۔ خیر' چوہدری سیف الدین صاحب' یہ اخبارات میں کیا شائع ہورہا ہے میرے اور آپ کے بارے میں؟"

چوہدری مسکرایا "اخبار والے بات کا بتنگڑ بنارہے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ مجھے یقین کرلینا چاہیے؟ چوہدری صاحب جتنے زرخرید صحافی آپ کے پاس ہیں' اس سے زیادہ میرے غلام ہیں۔ یہ آپ کی پرانی حکمتِ عملی ہے۔ آپ ثبوت ملاحظہ کریں گے؟" وہ اٹھی اور اس نے چوہدری سیف سے منسوب ہر خبر کے تراشوں کی ایک فائل اس کے سامنے ڈال دی۔ یہ فائل سینٹر ٹیبل کے نچلے حصے میں رسالوں کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔

سیف نے فائل کو کھول کے دیکھا اور خفت سے اس کا رنگ اڑگیا۔ اس فائل میں چوہدری سیف کی ہوسناکی کے سارے افسانے تھے جو حقیقت پر مبنی تھے مگر چوہدری کے ایما پر ان میں زیب داستان کے لیے بہت کچھ بڑھادیا گیا تھا۔ اب وہ انہیں جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔

"دیکھو جی' یہ سب..."

"ہوتا رہتا ہے۔ چھپتا رہتا ہے۔ رئیسوں کے شوق ہیں اور جن کے ساتھ آپ کا نام آیا وہ کون سی شریف زادیاں تھیں۔ یہی کہیں گے نا آپ؟ پرانی باتیں ہیں' اب ان کا کیا ذکر۔" گلناز بڑے حوصلہ افزا انداز میں مسکرائی "چلیں چھوڑیں چوہدری صاحب' پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے..."

چوہدری ڈھٹائی سے ہنسا "ماشاءاللہ اتنی سمجھ دار ہو آپ..."

"مگر یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں بے وقوف ہوتی تو ضرور آپ کے لیے ایک اور رنگین داستان کا عنوان بن جاتی پھر داستانِ ماضی ہوجاتی اور اس فائل کے کسی تراشے سے زیادہ اہم نہ رہتی.... مگر ایسا نہیں ہوگا گلناز کے ساتھ چوہدری صاحب!"

"آخر.... آپ کیا چاہتی ہو؟"

"میں نے آپ کو دوٹوک الفاظ میں بتادیا تھا.... میری شرائط..."

چوہدری نے برہمی سے کہا "ہر شرط منظور ہے مجھے۔ بتاؤ کون سی کوٹھی تمہارے نام کروں؟ کس شوروم سے کون سی گاڑی اٹھانی ہے۔ کتنی رقم حق مہر کے نام پر تمہارے اکاؤنٹ میں ڈالنی ہے؟ تمہیں اندازہ ہے کہ یہ سب ایک کروڑ کے لگ بھگ ہوجائے گا۔"

"آپ تو خاندانی رئیس ہیں۔ زمیندار' صنعتکار' ایم پی اے اور پتا نہیں کیا کچھ..... مجھ سے درخواست کریں کہ میں غریب آدمی ہوں۔ ایک کروڑ نہیں ہیں میرے پاس۔ میں سب معاف کردوں گی" گلناز اس کے اور قریب ہوگئی۔ اس کی ہنسی کے ساتھ گلناز کے ریشمی بدن کے نشیب وفراز بھی کھلکھلا کے ہنسنے لگے۔

سیف کے جذبات میں تلاطم برپا ہوگیا۔ اس نے گلناز کو دونوں ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں سمیٹ لیا "ایسا کیوں کرتی ہو تم میرے ساتھ؟"

گلناز نے ایک شریر چیخ ماری "اماں...!"

سیف نے گھبرا کے اسے چھوڑ دیا "گلناز۔ ایسا نہ ہو کہ میں بالکل ہی پاگل ہوجاؤں۔ تمہیں بھی گولی ماردوں اور خود بھی مرجاؤں۔"

گلناز نے اپنے بال سمیٹے "نہیں سیف۔ تم بڑے سیانے ہو۔ سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ اسی لیے تم ایک کامیاب آدمی ہو۔ زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب ہو۔ تمہارے لیے ایک کروڑ کچھ بھی نہیں۔ تمہاری طاقت کے سامنے میری کیا اوقات ہے۔ تمہارے آدمی ایک اشارے پر جب چاہیں مجھے اٹھا کے لے جاسکتے ہیں اور تم جب تک چاہو مجھے استعمال کی چیز سمجھ کے رکھ سکتے ہو اور جب دل بھرجائے تو اپنے انہی آدمیوں سے کہہ سکتے ہو کہ اس کو مار کے ایسی جگہ گاڑ دو جہاں قیامت سے پہلے اس کا سراغ کسی کو بھی نہ ملے۔ تم میری بوٹیاں کرکے اپنے کتوں کو کھلاسکتے ہو مگر یہ تمہاری جیت نہیں ہار ہوگی سیف۔ تم سب کچھ کرسکتے ہو مگر مجھ سے شادی کرکے دنیا کو نہیں دکھاسکتے کہ تم کو گلناز کی محبت بھی حاصل ہوگئی۔"

سیف دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامے بیٹھا رہا "دیکھو جی۔ میں آخر آپ کو کیسے سمجھاؤں.... کہ جو آپ چاہتی ہو وہ ناممکن ہے۔"

گلناز ہنسی "آپ جیسے مردوں کی لغت میں بھی یہ لفظ ہے؟"

"تم اسے مذاق سمجھ رہی ہو؟"

"یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے سیف۔ تم کیا نہیں کرسکتے۔ میں نے تو ایک بہت چھوٹی سی' معمولی سی شرط رکھی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ آسمان کے تارے توڑلاؤ یا پہاڑ کاٹ کے دودھ کی نہر نکالو میرے لیے۔"

سیف نے سرہلایا "نہیں۔ یہ معمولی شرط نہیں ہے۔ میں اسے طلاق نہیں دے سکتا۔"

"طلاق کیوں نہیں دے سکتے۔ ہر شخص کو جس نے کسی عورت سے نکاح کیا ہو بحالت مجبوری اس کو طلاق دینے کا شرعی حق حاصل ہے۔ تم خود تسلیم کرتے ہو کہ اسے تم نے کبھی پسند نہیں کیا اور یہ شادی خاندانی جبر کا نتیجہ تھی۔ تم اس مجبوری سے چھٹکارا پانا چاہو تو..."

"پلیز۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ یہ شادی میرے باپ کے حکم سے ہوئی تھی۔ بالکل ایسے ہی میرے بڑے بھائی کی شادی میرے تایا کی بیٹی سے ہوئی۔ میری بہنیں چچا تایا لے گئے۔ ہماری ایسی ہی روایات ہیں۔ باہر شادی کرنے کا مطلب ہوتا ہے حق وراثت میں غیروں کی شرکت۔ زمین ہمارے لیے سب کچھ ہوتی ہے۔ گھر کی عزت سے بھی زیادہ اور زمین کو تقسیم ہونے سے بچانے اور باہر جانے سے روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ کئی نسلوں سے ہم اس زمین کی اسی طرح حفاظت کر رہے ہیں۔"

"سیف۔ اگر تمہارے چچا تایا کی کوئی بیٹی نہ ہوتی..."

"تو میری شادی نہ ہوتی..... میرا ایک چچا پچاس سال کی عمر میں بھی کنوارا بیٹھا ہے۔"

"لغوی معنوں میں کنوارا...... ایسے نہیں جیسے لڑکی کنواری ہوتی ہے۔ دوشیزگی کی جملہ شرائط کے ساتھ۔"

سیف مسکرانے پر مجبور ہوگیا "تم تو جانتی ہو۔ ہمارے معاشرے میں کنوارپن کا تصور ہی یک طرفہ ہے۔ صرف عورت کے لیے۔ میرے اس چچا کو شادی نہ ہونے کا کوئی غم نہیں۔ وہ گھرداری کے سارے جھمیلوں سے بچا ہوا ہے۔ بیوی اگر ایک عورت ہوتی ہے تو اسے بیویوں کی کوئی کمی نہیں۔ جسے پیا چاہیں وہی سہاگن۔"

"گھر کے ساتھ ایک اور جذباتی رشتہ ہوتا ہے آدمی کا۔ بچے.... مگر آدمی کہاں' تم تو چودھری ہو۔"

"طنز مت کرو۔" سیف بولا "میرا چچا اپنے بھتیجوں کو اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہے۔"

"برا نہ مانو تو ایک گستاخ سوال کروں؟ بلکہ جان کی امان پاؤں تو....."

"ایسی کیا بات ہے؟" وہ ہنسنے لگا۔

"میں نے سنا ہے.... کہ ایسی صورت میں ہمارے یہاں بھی مشترکہ خاندانی نظام چلتا ہے جو مغرب میں بے راہرو نسل نے اپنا رکھا ہے۔ مشترکہ شوہر مشترکہ بیویاں اور مشترکہ بچے...."

سیف کا چہرہ تاریک ہوگیا "تم یہ پوچھ رہی ہو کہ جن بھتیجوں کو وہ اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتا ہے' ان میں سے کتنے اس کے بیٹے ہیں؟ تم سمجھتی ہو کہ یہ ہماری خاندانی غیرت کے لیے کتنی بڑی گالی ہے مگر تم نے بڑی چالاکی سے خود کو اس جواب سے بچالیا" سیف نے جیب سے ریوالور نکالا اور اس کا رخ گلناز کی طرف کردیا۔

"تم اس کا جواب دینے کے پابند نہیں ہو.... اور جواب میں سچ کہنا بھی ضروری نہیں" گلناز نے خود کو پرسکون رکھا۔

سیف نے ایک گہری سانس لی اور ریوالور کو واپس رکھ لیا۔

"اس کا صحیح جواب میں کیسے دے سکتا ہوں۔ شاید دنیا میں کوئی مرد نہیں دے سکتا۔ وہ کس کا بیٹا ہے' یہ بات صرف اس کی ماں جانتی ہے۔"

گلناز نے سوچ کے کہا "یو آر رائٹ۔ چلو میں اپنا سوال واپس لیتی ہوں۔ مرد تو خیر گزارا کرلیتے ہیں بلکہ بقول تمہارے گھرداری کے جھنجھٹ سے بچ جاتے ہیں اور خوش رہ سکتے ہیں۔ عورتیں کیا کرتی ہیں؟"

"وہ کیا کرسکتی ہیں۔ میری پھوپی تمام عمر ایسے ہی بیٹھی رہی۔ ایک تایا کی بیٹی گھر سے نکل گئی تھی۔ ایک ایم اے پاس اسکول ٹیچر کے ساتھ جو اسے گھر میں پڑھانے آتا تھا۔ گاؤں کے ہی ایک دکان دار کا بیٹا تھا۔ چھ مہینے بعد ان کا سراغ مل گیا لیکن انہیں پتا چل گیا اور وہ غائب ہوگئے۔ ڈیڑھ سال بعد پھر پتا چلا کہ وہ کراچی میں ہیں۔ اس لڑکے کا باپ خود اسے واپس لانے گیا۔ ہم نے اسے یقین دلادیا تھا کہ اب بات پرانی ہوگئی ہے اور ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ پڑھا لکھا شریف لڑکا ہے۔ تم اسے لے آؤ' ہم نے اسے معاف کیا۔ وہ پھر بھی خوف زدہ تھا مگر میرے باپ نے قرآن پر حلف اٹھاکے کہا کہ یہ چوہدری رب نواز کا وعدہ ہے۔"

گلناز دم بخود رہ گئی "جھوٹا حلف اٹھالیا اس نے قرآن پر؟"

"گلناز۔ مجبوری میں حلال بھی حرام ہوجاتا ہے" سیف بولا "جب اس کا باپ بیٹے کو اور اپنی بہو کو واپس لایا تو بہت خوش تھا۔ کیونکہ وہ دادا بھی بن چکا تھا۔ ان کے ساتھ چھ ماہ کا بچہ بھی تھا۔"

گلناز کی آواز خوف سے کانپنے لگی "تم نے....اسے بھی ماردیا؟ چھ مہینے کے بچے کو بھی؟"

"سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے۔ اس پر ترس کھانے والا احمق کہلاتا ہے۔ وہ شام کو ٹرین سے شہر پہنچے۔ گاؤں تک آتے آتے رات ہوگئی۔ انہیں لانے کے لیے تانگا ہم نے ہی بھیجا تھا۔ وہ بڑے خوش تھے کہ ان کے استقبال کے لیے سسرال سے شاہی سواری بھیجی گئی ہے۔ آدھے راستے میں ہمارے آدمی کھڑے تھے۔ اپنے چاچا کے ساتھ میں بھی تھا۔ تانگا خالی واپس آگیا۔ کوچبان ہمارا پرانا نمک خوار تھا۔ اس نے سب کے سامنے بتایا کہ وہ نہیں آئے۔ اس نے ساری گاڑی کے مسافر دیکھ لیے پھر ٹرین کے راولپنڈی روانہ ہونے تک وہ باہر انتظار کرتا رہا مگر اس ٹرین پر وہ نہیں تھے۔ سب نے اس پر یقین بھی کیا۔"

"سب سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"گاؤں کے معززین نمبردار' پٹواری' حکیم صاحب' مولوی صاحب' اسکول کا ہیڈ ماسٹر۔" سیف مسکرایا "ان کو پہلے سے پتا تھا کہ وہ نہیں آسکتے۔"

"ان تینوں کو قتل کرادیا گیا؟"

"چاروں کو" سیف نے تصحیح کی "تین نسلوں کو۔ چار افراد کو۔"

خاموشی کے ایک پرخوف وقفے کے بعد گلناز نے کہا "اور یہ سب مجھے بتانے کے بعد بھی تم مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں تم پر اعتبار کرلوں۔ اگر قرآن پر اٹھایا ہوا حلف ایک مجبوری بن جاتا ہے

تو نکاح کیا ہے؟"

"دیکھو گلناز! میں تم سے باقاعدہ' شرع اور قانون کے مطابق نکاح کروں گا اور تمہیں پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ کیونکہ تم ہمارے خاندانی سماج اور اس کی روایات کا حصہ نہیں ہو۔ ہم جتنی شادیاں چاہیں کریں' چار کی شرعی حد کا خیال رکھتے ہوئے۔"

"لیکن وہ بیوی دوسرے درجے کے شہری کی طرح ان حقوق سے محروم رہتی ہے جو تمہاری پہلی اور خاندانی بیوی کو حاصل ہوتے ہیں؟ میری اولاد تمہاری وارث نہیں ہوسکتی۔ یہ کون سی شرع میں ہے اور کس قانون میں ہے جناب چوہدری سیف الدین صاحب؟" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"وہ یقیناً میرے وارث ہوں گے' میرے نام کے' میرے بزنس کے۔ زمینداری الگ چیز ہے۔ اس کے مالک ہم سب ہیں۔ چوہدری رب نواز کے وارث۔ اس میں سے باہر کے کسی آدمی کو دو گز زمین بھی نہیں مل سکتی مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے میرے پاس۔ فیصل آباد کی ٹیکسٹائل مل ہے۔ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ میری ذاتی کوٹھیاں ہیں۔"

"میں آپ کی مجبوری کو سمجھ چکی ہوں۔ آپ مجھے دولت دے سکتے ہیں' عزت نہیں۔ میرا مسئلہ عزت کا ہے۔ دولت کی مجھے کوئی کمی نہیں۔ آپ جیسے رئیس بہت ہیں جو میرے ایک اشارے پر دولت کے انبار لگا سکتے ہیں۔ میں دوسرے درجے کی بیوی کے منصب پر فائز ہونے کے لیے بالکل تیار نہیں۔"

"گلناز۔ میں اسے طلاق دوں گا تو..... خاندان سے باہر ہوجاؤں گا" سیف نے تقریباً رو کر کہا۔

"پھر کیا ہوا۔ تم بھوکے نہیں مروگے۔ کروڑوں تمہارے اپنے ہیں۔ تم صنعتکار رہو' بزنس مین ہو۔ ایم پی اے ہو۔"

"مگر زمینداری ہماری نسلوں کی شان ہے۔ دولت تو کنجر بھی کما لیتے ہیں۔ بزنس مین تو موچی بھی بن جاتے ہیں۔ ایک بوٹ ہاؤس کھول کے اور اسمبلی کی رکنیت آنی جانی ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ آپ پہلے زمیندار ہیں۔ اس کے بعد ایک چوہدری پھر ایک خاندانی بیوی کے شوہر۔ اس کے بعد اسمبلی کے ممبر اور صنعتکار وغیرہ پھر گلناز کے چاہنے والے۔ اس محبت کی ترجیح بہت نیچے ہے آپ کی دیگر ترجیحات میں۔ آپ میں تو ایک معمولی اور کم حیثیت کے مزدور یا کلرک کے برابر بھی ہمت نہیں ہے جسے بیوی پسند نہ ہو یا وہ دوسری کرنا چاہتا ہو تو سوچتا نہیں۔ طلاق کے تین لفظ بول کے ایک کو رخصت کرتا ہے یا اس سے پوچھے بغیر ہی دوسری گھر لے آتا ہے۔"

"ضد مت کرو گلناز۔ میری مجبوری کو سمجھے بغیر مجھے ذلیل مت کرو۔"

"چلیں چوہدری صاحب' آپ کی زمینداری آپ کو مبارک۔ آپ لکھوالیں مجھ سے پکے کاغذ پر کہ میں یا میرے بچے اس زمین میں سے ایک انچ نہیں مانگیں گے۔ آپ کسی وکیل سے قانونی دستاویز بنوا کے مجھ سے مجسٹریٹ کے سامنے دستخط کرالیں۔ میں آپ کے خاندان کا حصہ نہیں بنوں گی اور نہ آپ کے خاندان کی خودغرض' سفاک اور خونی روایات کا۔ میں بیانِ حلفی دے سکتی ہوں۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"تو پھر میرے وعدے کو ہی بیانِ حلفی سمجھ لیں..... میں کسی مجبوری کے تحت کوئی وعدہ نہیں کررہی ہوں۔ مجھے واقعی وہ زمین نہیں چاہیے۔ نہ مجھے بہو بن کے اس خاندانی حویلی میں قید ہونے کا شوق ہے۔"

سیف کا چہرہ پرامید ہوگیا "پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

"نہیں سیف۔ اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اپنے شوہر کو شیئر نہیں کرسکتی۔ کسی بھی دوسری عورت کے ساتھ۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ عورت دکان یا کوٹھی' کار یا گھوڑی نہیں ہے۔ سیف کی بیوی گلناز ہوگی تو کوئی اور نہیں ہوگی۔ اور بہت ہیں فلموں میں۔"

سیف نے تڑپ کے کہا "گلناز۔ اتنی بے رحم نہ بنو اور جو چاہو کہو مگر ایسا مت کہو۔ میں محبت کرتا ہوں تم سے۔ جو پہلے میں نے کسی سے نہیں کی۔"

"شاید ان سے بھی یہی کہا ہوگا تم نے..... جن سے پہلے تمہیں محبت ہوگئی تھی۔"

"ایسی بات نہیں ہے گلناز۔ تم سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں نے خود ہی تمہیں سب بتادیا ہے کہ میں کیا تھا۔"

"تم اب بھی وہی ہو شاید لیکن مشکل یہ بھی ہے سیف..... کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ مجھے بھی ایک ایسے مرد کی تلاش تھی..... جیسے تم ہو۔ جس کے ساتھ میں عزت اور عافیت کی زندگی گزار سکوں۔ جو اس فلمی دنیا میں رہ کے نہیں مل سکتی..... لیکن تم اتنے مجبور ہو۔ پانچ سال میں کسی نے میرے سامنے یہ سوال نہیں رکھا؟ مجھ سے شادی کروگی گلناز؟ اور ان میں کچھ بڑے اچھے لوگ تھے ہر لحاظ سے۔ کامیاب' مخلص اور کھرے' پرکشش۔ وہ مثالی شوہر بن سکتے تھے اور ان کی زندگی میں کبھی کوئی دوسری عورت میرے بعد نہ آتی۔ یہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں..... مگر میں نے سب کو انکار کردیا۔ صرف اس لیے کہ میں ان سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی..... کہ مجھے بھی ان سے محبت ہے۔ بس سمجھ لو کہ ہم ندی کے دو کناروں کی طرح مل نہیں سکتے۔ تمہارے لیے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینا ممکن نہیں۔ میرے لیے تمہاری دوسری بیوی بننا ممکن نہیں۔"

وہ ایک اچھی اداکارہ تھی۔ سید پور سے آنے والی عائشہ نے صرف پانچ سال میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ فلمی افق کا سب سے درخشندہ ستارہ بن گئی تھی۔ بے شک یہ مقام حاصل کرنے کے

لیے اسے ہوس کی قربان گاہوں پر نہ جانے کتنی بار اپنا سب کچھ قربان کرنا پڑا تھا مگر وہ وقت گزر گیا تھا اور یہ گزرتا وقت بہت سے رازوں پر سے پردہ اٹھا گیا تھا۔ خیر خواہی اور ہمدردی کے نقاب میں چھپے کئی چہرے اس کے سامنے بے نقاب ہو گئے تھے۔ بہت سی تلخ لیکن اٹل حقیقتیں اس پر واضح ہو گئی تھیں۔ ایسی ہی بے رحم حقیقتوں میں اس کی طلاق اور شوہر کی موت کا معاملہ تھا۔ سید پور کی عائشہ اب اس پوزیشن میں تھی کہ اپنی بے بسی اور مظلومیت کا ان سب سے پورا حساب لے سکے جنھوں نے اس سے کامیابی کے سفر میں ہر قدم پر خراج وصول کیا تھا۔

ایک اچھی اداکارہ بننے کے لیے اس نے صرف رقص ہی نہیں سیکھا تھا اور بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس نے مکالموں کی ادائیگی سیکھی تھی۔ جذبات اور تاثرات کا بھرپور اظہار سیکھا تھا۔ خاموشی اور آنکھوں کی زبان سے دل کی بات کہنا سیکھا تھا۔ دکھ کے بغیر آنسو بہانا اور غم زدہ دل کے ساتھ بھرپور خوشی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجانا سیکھا تھا۔

اس نے بڑی صفائی سے صوفے کی سائڈ پر رکھی ہوئی شیشی سے ایک انگلی پر گلیسرین لگائی اور آنکھوں میں آجانے والے دل شکستگی اور دکھ کے آنسوؤں کا ایک قطرہ پھسل کے اس کے رخساروں پر آگیا۔ عام طور پر اسے گلیسرین جیسے مصنوعی سہاروں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور یہ اس کی اداکاری کا کمال سمجھا جاتا تھا کہ وہ خود پر سوگوار موڈ طاری کر کے آنسو بہانے پر قادر ہے مگر آج وہ کوئی رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اس رول کے لیے وہ نہ جانے کب سے تیاری کر رہی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اس میں ری ٹیک کی گنجائش نہیں ہوگی۔

سیف بے چین ہو کے اٹھا "گلناز!"

اس نے سیف کو دور ہی روک دیا "رہنے دو۔ صرف باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم باتوں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"

وہ ایک دم بیٹھ گیا "میں کروں گا۔ ایک صورت ہے گلناز۔ جس سے تمہاری شرط پوری ہو سکتی ہے۔ اسے طلاق دیے بغیر۔"

"یہ نہیں ہو سکتا سیف۔" وہ منہ چھپا کے رونے لگی۔

وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "ہو سکتا ہے گلناز۔ دیکھو' یہ آنسو میرے دل کو جلا رہے ہیں۔ انہیں روک لو' میں تمہیں دکھی نہیں کر سکتا۔ تمہاری خوشی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں میں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میری بیوی صرف تم رہو گی۔ میں صرف تمہارا ہو کے رہوں گا... یہی چاہتی ہو نا تم؟"

"تم اسے چھوڑ دو گے؟"

"نہیں۔ میں اسے قتل کر دوں گا" سیف نے کہا۔

گلناز نے سینے پر ہاتھ رکھ کے ایک چیخ ماری "قتل...؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"ہاں۔ پاگل تو کر دیا ہے مجھے تم نے..... اب اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں..... دیکھو نا' میں اسے طلاق نہیں دے سکتا مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل طبعی انداز میں اچانک مرجائے۔"

گلناز نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔"

"ڈرو نہیں۔ کسی کو شک نہیں ہوگا مجھ پر..... نہ مجھے پولیس پکڑے گی اور نہ کوئی مقدمہ چلے گا..... ہم عزت دار لوگ ہیں اور ہماری عزت کے حصار بہت مضبوط ہیں۔ قانون کی توپ آج تک اس حصار میں رخنہ نہیں ڈال سکی۔ تمہیں معلوم ہے کتنے قتل کیے ہیں آج تک میں نے؟ اس پستول سے اور اپنے باپ کی شکاری رائفل سے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خود مجھے یاد نہیں مگر قتل کرنا پڑ جاتا ہے گلناز۔ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ پرچون فروش جس کا ایم اے پاس بیٹا میری تایا زاد بہن کا شوہر بن گیا تھا' حرام زادہ۔ ہماری نسل خراب کرنے والا۔ لالچی کتا۔ زندہ رہتا تو زمین جائداد میں بھی اپنا حق مانگتا۔ اس کو میں نے خود گولی ماری تھی۔ یہ بتانے کے بعد کہ ایم اے کی ڈگری سے ہماری غیرت بڑی چیز ہے۔ اس کی اولاد کو زندہ گاڑ دیا تھا میں نے اسی کے ساتھ۔ بس اپنی تایا زاد کو میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اسے میرے چاچا نے گلا گھونٹ کے مارا تھا۔ اس سے پہلے بھی..."

"بس کرو سیف۔ خدا کے لیے بس کرو۔" گلناز چیخی "ایک بے گناہ عورت کی موت مجھے منظور نہیں۔ میں اس کے خون کا الزام لے کر تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں ہرگز تم سے شادی نہیں کروں گی پھر کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔"

"ٹیک اِٹ ایزی گلناز" اس نے گلناز کے شانوں کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیے "تم پر کوئی الزام نہیں آسکتا۔"

"چھوڑ دو مجھے۔ جاؤ' چلے جاؤ یہاں سے۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ چھوڑ سکتے ہو تو اسے چھوڑ دو۔ اس لیے کہ تم اس کے ساتھ خوش نہیں تھے۔ تم نے کہا تھا کہ وہ جبر کی شادی تھی۔ قتل کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی سیف۔ تم نے کہا تھا کہ اس کا باپ بھی جاگیردار ہے۔ اس کی اور تمہاری ایک ہی حویلی ہے۔ میں سمجھی تھی کہ طلاق کے بعد وہ اسی حویلی میں رہے گی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا..... بس وہ تمہاری بیوی نہیں رہے گی۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں چاہتی تھی۔"

"اب تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں صرف اپنے باپ کو شریک راز کروں گا۔"

"کیا...؟ تمہارا باپ....." وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

"اسے تو بتانا ہی پڑے گا کچھ۔ تاکہ وہ میری مجبوری کو سمجھ لے۔ یہ مان لے کہ اس عورت کا قتل میرے لیے کیوں ناگزیر ہو گیا ہے۔"

"اف۔ سیف یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے خوف آرہا

ہے تم سے۔"

چوہدری سیف الدین اب مطمئن اور پُر اعتماد ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ کا مفہوم بہت واضح تھا "دیکھو نا.... ابھی تم نے پوچھا تھا.... کہ تمہارا پچاس سال کا کنوارا چچا کیسے گزارا کرتا ہے۔ میں اپنے باپ کو بتا سکتا ہوں کہ وہ کیسے گزارہ کرتا ہے۔"

"تم.... تم' یہ گندہ..... شرمناک الزام لگاؤ گے اس پر....؟"

"الزام؟ یہ تو حقیقت ہی کہلائے گی.... میرا باپ مجھ پر یقین کرے گا۔ وہ اپنے بھائی کو قتل نہیں کر سکتا۔ وہ بہت بوڑھا ہے اور کم ہمت ہے اس معاملے میں.... لیکن وہ مجھے اجازت دے گا۔"

"شٹ اپ۔ شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔ میں صورت نہیں دیکھنا چاہتی دوبارہ تمہاری" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔

سیف نے پریشان ہو کے اندر آجانے والی موسی کو دیکھا پھر آہستہ سے گلناز کے گالوں پر تھپکی دی اور مسکرا کے باہر نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ دورہ وقتی ہے۔ اس وقت اسے چلا جانا چاہیے۔ وہ اب گلناز کی شرط پوری کر سکتا ہے۔ یہ تو کوئی بہت بڑا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ بس اسے خیال ذرا دیر سے آیا۔

اس کے جاتے ہی گلناز پُرسکون ہوگئی۔ اس نے ڈرائنگ روم میں رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو ایک بٹن دبا کے آف کیا۔ کیسٹ اب ختم ہونے ہی والا تھا اور سیف نے اس میں وہ سب کہہ دیا تھا جو گلناز اس سے کہلوانا چاہتی تھی اور جو اسے تختہ دار تک پہنچانے کے لیے ہی نہیں اس کے خاندان کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھا۔"

گلناز کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ سیف کو دیوانگی کی اس انتہا تک لانے کے لیے اس نے بڑی تیاری کی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ مسکرانے لگی ـــ فلم اسٹوڈیو کے ایک ساؤنڈ ریکارڈسٹ نے گلناز کی بہت مدد کی تھی۔ اس کی ایک نگاہِ التفات نے نئے اور ذہین ساؤنڈ انجینئر کو اس درجہ جذباتی کر دیا تھا کہ اس نے گلناز سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ ایسے خفیہ طریقے پر وہ کس سے ہونے والی باتیں ریکارڈ کرنا چاہتی ہے اور کیوں؟ گلناز نے سیف کی ہر ٹیلی فون کال ریکارڈ نہیں کی تھی۔ وہ بہت سوچ بچار کے بعد اپنا اسکرپٹ تیار کرتی تھی کہ اسے کیا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا ہے۔ بیشتر صورتوں میں جواب اس کی توقعات کے مطابق ملے تھے اور گفتگو کے ہر کیسٹ میں قانونی طور پر گلناز کی پوزیشن محفوظ تھی۔ کوئی اس پر یہ الزام بھی عائد نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے سیف کو اکسایا یا وہ بالواسطہ طور پر کسی بات کا سبب بنی۔

آج بھی وہ سیف کو اس کے قاتلانہ عزائم سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتی رہی تھی اور اس پر یہ الزام نہیں آسکتا تھا کہ سیف نے جو کچھ کیا اس کی وجہ سے یا اس کی مرضی اور اشارے پر کیا۔ اس نے اپنا رول بالکل صحیح ادا کیا تھا۔

گلناز نے ایک بار پھر کیسٹ کو پوری توجہ سے سنا اور پھر اس کی دوسری کاپی بنانے کے لیے ڈبنگ والا بٹن دبا دیا۔ ڈبل کیسٹ والے ٹیپ ریکارڈر نے صرف تین منٹ میں دوسری کاپی تیار کر دی۔ گلناز نے اسے چلا کے سنا اور مطمئن انداز میں سرہلایا۔ اس کی ساؤنڈ کوالٹی بھی اے ون تھی۔ اس نے اوریجنل کو اپنی خواب گاہ کی اس برگلر پروف تجوری میں لاک کیا جس میں وہ اپنے قیمتی زیورات' نقدی اور اہم دستاویزات محفوظ رکھتی تھی۔ تجوری میں سیف سے ہونے والی گفتگو کے چھ کیسٹ پہلے سے موجود تھے۔ تین کیسٹ ٹیلی فون سے ریکارڈ کیے گئے تھے اور آدھے گھنٹے میں سیف نے کوئی خطرہ محسوس کیے بغیر بہت کچھ کہہ دیا تھا جو کسی بھی عدالت میں خود اس کے خلاف استعمال ہو سکتا تھا۔

گلناز نے ایسا ہی ایک کیسٹ نکالا جس پر دو مہینے پہلے کی تاریخ والی چٹ لگی ہوئی تھی۔ اس نے کیسٹ کو پلیئر میں لگایا اور دلچسپی سے سننے لگی۔

پہلے دس منٹ کی گفتگو کے کچھ حصے قابلِ اعتراض سمجھے جا سکتے تھے اور سنسر کی زد میں آتے تھے۔ کچھ آوازیں خلوت کا ایسا منظر پیش کرتی تھیں جو ٹی وی پر دکھایا جاتا تو اس کے سامنے رنگین چارخانے ایک جال سا پھیلا دیتے۔

اس کے بعد گلناز نے ہنستے ہنستے کہا تھا "سنا ہے جناب کو فلموں میں اداکاری کا شوق بھی ہوا تھا۔"

"شوق میں ایسے ہی خواری ہوئی۔"

"کیوں؟ یہ تو بڑا دلچسپ کام ہے۔ کرتے رہتے تو آج ہیرو ہوتے کسی فلم میں میرے ساتھ۔"

وہ ہنسا "فلمی ہیرو؟ اجی ہم تو اس سے کہیں زیادہ ہو گئے آپ کی ایک نظر سے..."

"اوفوہ..... بدتمیزی چھوڑو۔ یہ بتاؤ رول کیا تھا تمہارا....؟ کتنے پیسے ملے تھے؟"

"پیسے..... حد کرتی ہو جی آپ بھی۔ اب ہم ایسے گئے گزرے ہیں کہ پیسوں کے لیے کام کریں گے فلموں میں۔ وہ تو بس ایک اپنا یار تھا' اس نے کہا کہ ایک رول ہے تم کر لو۔ ہم نے سوچا کہ سارے شوق پورے کیے ہیں تو یہ بھی سہی مگر بعد میں کھیل خراب ہو گیا۔"

گلناز ہنسی "کیوں؟ اداکاری نہیں کر سکے؟"

"نہیں جی..... اپنی منہ ماری ہو جاتی تھی اکثر ڈائریکٹر کے ساتھ۔ وہ کہتا تھا کہ ریہرسل پر آؤ۔ ایک دو بار شوٹنگ پر میں دیر سے پہنچا۔"

"صرف ایک دو بار....." گلناز شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

"اوجی دس بار سمجھ لو" سیف ہنس پڑا۔

"اور ایسے ہی دس بار آپ غائب بھی ہوئے.... شوٹنگ رکی رہی۔"

سیف نے کہا "اچھا.... تو سب بتا دیا ہے لوگوں نے۔ سچی بات

یہ ہے جی کہ کہیں بھی وقت پر پہنچنا اور ڈسپلن کی پابندی کرنا اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ ہم کون سا روزگار کے لیے جاتے تھے کہ ہمیشہ وقت پر پہنچ جائیں ورنہ نوکری جائے گی۔ وہ ہدایت کار بے عزت کرنے لگا سب کے سامنے۔"

"چوہدری صاحب۔ رئیسوں کو ایسے شوق نہیں پالنے چاہئیں اور شوق کیا کم ہیں آپ کے۔"

"میں تو مارتا اس..... کو... پھر اس کے بعد ایک اور بات ایسی ہوگئی..... خیر چھوڑو' آؤ..."

"نہیں.... پہلے بتائیں کیا بات ہوگئی تھی۔"

"ہدایت کار ایک بندہ پکڑ لایا کسی گاؤں سے..... میری شکل کا۔"

گلناز ہنسی "آپ کی شکل کا بندہ کس گاؤں میں مل گیا اسے۔ کہیں آپ کا کوئی جڑواں بھائی تو نہیں..."

"ادھر ایک گاؤں ہے سید پور۔ وہاں شوٹنگ تھی۔ میں کسی مصروفیت کی وجہ سے نہیں پہنچ سکا۔ کرم داد اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔"

"کرم داد کون؟" گلناز انجان بن گئی۔

"وہی میرا ہم شکل۔ شوٹنگ دیکھ رہا تھا۔ ہدایت کار نے میری جگہ اسے رکھ لیا۔ نام بھی سیفو رکھ دیا اس کا' سؤر کے بچے نے اور مجھے کاسٹ سے باہر کردیا۔ یہ بڑی بے عزتی کی بات تھی میرے لیے۔"

"ہاں۔ بے عزتی تو ہے۔ آپ کوئی معمولی آدمی ہیں۔ کوئی ایکسٹرا تھے یا دوسرے درجے کے ایکٹر۔ نکال کیسے دیا اس نے؟"

"وہ اپنے آپ کو بڑا ہدایت کار سمجھتا تھا۔ میں نے اس سے بات کی تو وہ میرے گلے پڑ گیا کہ چوہدری صاحب یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔ بہت نقصان ہو چکا ہے اور فلمساز مجھے باتیں سناتا ہے کہ تمہارا کنٹرول نہیں اخراجات پر۔ میں نے کہا کہ چلو نقصان میں پورا کردیتا ہوں مگر ایسے تو بے عزتی ہوگی میری ان سب کے سامنے جو جانتے ہیں کہ چوہدری سیف الدین ایک فلم میں سیفو کے نام سے اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہا ہے۔"

"اداکاری کے جوہر؟" گلناز شوخی سے ہنسی "وہ تو جناب دکھاتے ہی رہتے ہیں مگر صرف رومانٹک رول میں۔"

سیف بھی ہنسا "ڈائریکٹر ہاتھ جوڑنے لگا کہ مجھے معاف کرو چوہدری صاحب۔ میں نے دوسرا بندوبست کرلیا ہے۔ فلم اتنی بن چکی ہے کہ آپ کا رول تو نکالنے سے رہا۔ ڈپلی کیٹ سے کام چلاؤں گا۔ میں نے کہا کہ میرا ڈپلی کیٹ کہاں سے آگیا؟ اس نے کہا کہ ڈپلی کیٹ سب کے بن جاتے ہیں مگر کسی خطرناک رول میں کام لیتے ہیں ان سے۔ آپ کا تو بنا بنایا دوسرا ماڈل مل گیا ہے پھر اس نے کرم داد کا بتایا تو مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے کہا یہ تو حد ہوگئی۔ ہم جیسا دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔ چوہدری سیف تو بس ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔"

"بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے ہم شکل سے..... کتنی فلمیں بن چکی ہیں اس پر۔ ایک بار فلم میں آپ کی جگہ لے لیتا تو دوسری بار چوہدری سیف بن کے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ پہنچ جاتا کہیں آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے گھر۔ آپ کی خاص خواب گاہ میں۔"

"او جی' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس پاگل خانے کرم داد کو سمجھایا کہ وہ باز آجائے۔ واپس سید پور چلا جائے۔"

گلناز ہنسی "اتنی ہی شرافت سے سمجھایا تھا؟"

سیف پھر ہنسا "او جی۔ وہ تو اپنا طریقہ ہی ذرا دوسرا ہے۔ ہم نے اسے اٹھوا لیا تھا اور ٹھیک ٹھاک دھمکی دی تھی پھر بتا دیا تھا کہ وہ سیفو نہ بنے اور پیسوں کی ضرورت ہے تو ہم سے لے اور دفع ہو جائے۔"

"کیا وہ بھی نہیں مانا؟"

"اس بے چارے کی کیا مجال تھی کہ نہ مانتا۔ وہ بہت ڈر گیا تھا اور شاید بھاگ بھی جاتا مگر ایک تو اسے روکا ہدایت کار نے پھر اپنا ایک دشمن اس کا حمایتی بن کے سامنے آگیا۔"

"وہ کیوں سامنے آگیا؟"

"بس ایسے ہی..... دشمنی بھی تو ایک شغل کی طرح ہوتی ہے ہماری۔ ایسے ہی چلتی ہے۔ رانا شوکت علی نے خوامخواہ پنگا لیا اور وہ فلم خریدلی جس میں میرا رول تھا۔ فلم ساز کو دگنے پیسے دے دیے نامکمل فلم کے۔ وہ انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ رانا نے کہا کہ اب فلم ساز میں ہوں۔ اس نے سب کچھ وہی رکھا اور میری جگہ اسی کرم داد کو رکھا۔ نام بھی اس کا سیفو.... حرامی پن یہ کیا کہ اس فلم کے رائٹر کو کہا کہ سیفو کے سین بدل لو۔ ایک دو ذلیل کرنے والے سین ڈال دیے۔ اسے چوڑا بنا دیا تھا جو سڑک پر جھاڑو دیتا ہے اور ایک چوڑی سے عشق کرتا ہے پھر چوڑے مل کے اسے مارتے ہیں..... شروع کے رول میں نے کیے تھے۔ بعد میں کرم داد بن گیا تھا سیفو۔ فلم بن جاتی تو سارا شہر کیا سارا ملک دیکھتا میری بے عزتی۔ خاندان میں کیا منہ دکھاتا میں کسی کو اور یار بیلی کیا کہتے؟"

"اس کا مقصد ہی آپ کو ذلیل کرنا ہوگا؟"

"اور کیا.... مگر چوہدری سیف کو ذلیل کرنے والا ابھی کوئی مائی کا لال پیدا نہیں ہوا۔ رانا نے اس بے وقوف کرم داد کو بانس پر چڑھا دیا کہ بے فکر ہوجا۔ تیری حفاظت میں کروں گا۔ اسے اپنی کوٹھی میں جگہ دی اور پھر ساتھ ہی دے دیے پچاس ہزار روپے نقد کہ جا عیش کر۔ ایک گاڑی دی ڈرائیور کے ساتھ جو اس کا گن مین بھی تھا۔ اس کی حفاظت پر مامور تھا۔ کرم داد کا دماغ تو خراب ہونا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب کوئی اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا لیکن ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ بندوق کی گولیوں سے کھیلنے والے ہیں ہم..."

"تم نے گولی ماردی رانا کو؟"

"رانا کو؟" وہ ہنس پڑا "اوجی شیر بھی جنگل میں شیر کا شکار کرتا ہے؟ دشمنی کے بغیر زندگی کا کیا لطف ہے۔ میں اسے ماردوں تو اس کے بھائی بند مجھے ماردیں گے۔ ایک دوسرے کے خاندان تباہ اور ختم ہو جائیں۔ ہم ایسی دشمنی کا کھیل نہیں کھیلتے ایک بار اس نے میری سب سے اچھی گھوڑی مروادی۔ میرے ہی آدمی سے اسے زہر دلوادیا۔ تو میں نے اس کے آدمی سے اس کی فصل میں آگ لگوادی۔"

"اور گھوڑی کو زہر دینے والا یا فصل کو آگ لگانے والا؟ انہیں کیا سزا دی تم نے؟"

"میں نے تو اسے وہی زہر کھانے پر مجبور کیا۔ جو اس نے گھوڑی کو دیا تھا۔ رانا نے بھی اسے جلتی فصل میں پھنکوادیا۔"

"اچھا بتاؤ کہ فلم کا کیا ہوا؟" گلناز نے کہا۔

"وہ فلم نہیں بنی۔ درمیان میں جہاں رکی تھی، وہیں ڈبوں میں بند ہوگئی۔"

گلناز نے انجان بن کے کہا "مگر کیسے؟"

"اب سارا پوچھوگی.... بھئی ایک لڑکی تھی، کسی کالج میں پڑھاتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میرے بچوں کو پڑھاؤ۔ جتنی تنخواہ کالج میں ملتی ہے اس سے چار گنا دوں گا۔ گاڑی گھر سے لائے گی اور گھر چھوڑ دے گی۔"

"بعد میں آپ نے گھر بھی دے دیا ہوگا اور گاڑی بھی اس کے نام کردی ہوگی۔ کیا بہت خوب صورت تھی؟"

سیف ہنسنے لگا "خوب صورتی پر ہی تو مرتے ہیں ہم۔ خوب صورت تھی۔"

"مجھ سے بھی زیادہ...؟"

"لوجی کیسی بات کرتی ہو تم..... لاکھ حسین ہو کوئی مگر تمہاری جوتی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ بس اچھی لگی تو ہم نے بلا لیا اور وہ آگئی۔ سیانی لڑکی تھی، غریب ماں باپ کے گھر میں فاقہ کشی کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ بیمار ہوئے اور سرکاری اسپتال میں مرگئے۔ اسے نوکری بعد میں ملی۔ کالج کے ہوسٹل میں رہتی تھی کیونکہ وہ رشتے داروں کی صورت سے بیزار تھی۔ سمجھتی تھی کہ دنیا میں کچھ کام نہیں آتا۔ نہ ڈگری، نہ خون کا رشتہ۔ بس پیسہ اپنا ہوتا ہے اور غریب آدمی کو عزت عصمت وغیرہ کے چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔"

"یعنی آپ کے مطلب کی لڑکی تھی۔"

"وہ تو سب ہوتی ہیں مگر وہ بہت سیانی تھی۔ کہنے لگی مجھے اپنی سیکریٹری یا پی آر او رکھ لیں۔ میں نے اس سے زیادہ بڑا کام لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسے رانا کے پاس بھیج دیا سوالی بنا کے۔ اس نے بڑی ذہانت سے کام لیا اور مظلوم بن کے وہاں پہنچ گئی۔ بہت روئی دھوئی کہ زمانے نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ماں باپ اور رشتے دار ہیں نہیں۔ چوہدری سیف صاحب نے بچوں کو پڑھانے کے لیے رکھا تھا.. تو انہوں نے بھی.... رانا صاحب نے میری دشمنی میں اسے پناہ دی اور اس پر اتنے مہربان ہوئے کہ اپنی سیکریٹری بنالیا۔ دس ہزار اسے میں دیتا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرادیتا تھا۔ بیس ہزار رانا صاحب دیتے تھے۔ دن میں وہ ان کے آفس میں ہوتی تھی۔ مجھ سے بھی ملتی رہتی تھی اور ساری اندر کی خبریں دیتی رہتی تھی۔ معلوم نہیں اچانک اس کا دماغ کیسے خراب ہوگیا۔ وہ کہنے لگی کہ شادی کرلو مجھ سے۔ تم نے وعدہ کیا تھا۔"

"وعدہ کیا تھا آپ نے؟"

"اوجی وعدے تو بندہ کرلیتا ہے نظریۂ ضرورت کے تحت" رانا ہنسا "وہ بھی سمجھ لیتی تو اچھا تھا۔ اس نے تو مجھے بلیک میل کرنا شروع کردیا۔ کہنے لگی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ میں نے کہا کہ پھر مجھے کیا۔ اللہ کرے تم دس بار ماں بنو۔ نانی دادی بنو' کہنے لگی کہ اس بچے کے باپ تم ہو۔ لوجی، مجھے کیا پتا وہ بچہ میرا ہے یا رانا کا۔ کیا پتا وہ اسے بھی بلیک میل کررہی ہو۔ میں نے اسے کہا کہ اچھا کرلیں گے شادی بھی۔ تم ذرا کرم داد کو سمجھاؤ کہ رانا پر بھروسا نہ کرے۔ مارا جائے گا۔ ابھی وقت ہے۔ جان بچا کے بھاگ جائے ورنہ ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک کی طرح پس جائے گا مگر کرم داد نہیں سمجھا۔ لڑکی ساری رپورٹ مجھے دیتی تھی۔ میں ٹیلی فون کی گفتگو ریکارڈ کرتا رہا۔ بعد میں وہ سارے کیسٹ رانا کو بھجوادیے۔"

"او مائی گاڈ پھر رانا نے کیا حشر کیا اس لڑکی کا؟"

"پتا نہیں۔ وہ غائب ہوگئی۔ اب میدان حشر میں ملے گی تو پتا چلے گا کہ کیسے ماری گئی تھی۔"

"اور کرم داد..... جسے رانا نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا؟"

"کرم داد کا کیا ہونا تھا، مارا گیا وہ بھی آخر کار۔"

گلناز نے کہا "اسے بھی مروادیا رانا شوکت نے؟"

"نہیں۔ رانا شوکت کے سامنے وہ بے قصور بن گیا۔ رانا نے جب اپنی سیکریٹری کے کیسٹ سنے تو وہ سمجھ گیا کہ وہ لڑکی میرے کہنے پر اس کی سیکریٹری بنی تھی۔ دشمنی اور جنگ میں ایسا ہوتا ہے۔ ہر ملک اپنے جاسوس رکھتا ہے دوسرے ملک میں اور وہ دشمن کے اپنے بندے نظر آتے ہیں۔ ایک بڑا مشہور واقعہ ہے۔ امریکی جاسوسی کا ادارہ ہے سی آئی اے۔ بڑی دھوم ہے اس کی۔ تو سی آئی اے کا ایک نائب سربراہ کے جی بی کا آدمی تھا۔ ترقی کرتے کرتے وہ کہاں پہنچ گیا اور ظاہر ہے سارے راز روس کو دیتا رہا مگر زمانے کی جاسوسی کرنے والے بے خبر رہے.... تو سمجھ لو میں اور رانا بھی دو مخالف ملکوں کی طرح ہیں۔ جنہوں نے ایک دوسرے کے علاقوں میں اپنے اپنے جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں۔ رانا نے اپنی سیکریٹری کی ساری باتیں سن کے کرم داد کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ یہ سب سچ ہے؟ اس نے کہا کہ سچ ہے جناب۔ مجھے اس نے روکا تھا فلم میں کام کرنے سے اور یہ ساری باتیں ہوئی تھیں مگر میں نے تو اس کی بات نہیں مانی۔ رانا نے کہا کہ سؤر کے بچے، نمک حرام۔ فوراً مجھے

آ کے کیوں نہیں بتایا؟"

"بے چارہ۔ اس کا تو قصور نہیں تھا۔ شامتِ اعمال سے آگیا فلموں میں کام کرنے۔"

"او جی سب قسمت کے کھیل ہیں۔ اب اس کی شکل مجھ سے اتنی ملتی تھی۔ اس میں واقعی کرم داد کی غلطی نہیں تھی لیکن بدقسمتی سے اس کو ہدایت کار نے میرا رول دے دیا اور اس نے سوچے سمجھے بغیر قبول کرلیا۔"

گلناز نے اپنے انجانے پن کی اداکاری جاری رکھی "تو رانا نے نہیں مروایا اسے۔ اتنی بڑی غلطی کو معاف کردیا۔"

سیف ہنسنے لگا "اور وہ کیا کرتا۔ فلم کا پنگا جو لے بیٹھا تھا۔ ضد بھی پوری کرنی تھی۔ اچھے خاصے پیسے ڈال دیے تھے اس میں اور سب کو بتادیا تھا کہ وہ کیا حرامی پن کررہا ہے۔ تماشا دیکھنے والے بس تماشا دیکھ رہے تھے کہ رانا صاحب کی فلم ریلیز ہوتی ہے یا نہیں اور ریلیز ہونے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ چوہدری سیف الدین اتنی بے عزتی کے بعد کیا کرتا ہے۔ اس نے کچھ دن بعد شوٹنگ پھر شروع کردی۔ مجھے ساری خبریں مل رہی تھیں۔ رانا اس کی بڑی حفاظت کرتا تھا اس لیے میں نے خاص بندوں کی ڈیوٹی لگائی۔ ایک دن وہ اسے اسٹوڈیو سے ہی اٹھالائے۔ وہ باتھ روم گیا۔ ایک بندہ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کرم داد جیسے ہی اندر داخل ہوا۔ وہ بندہ بھی گھس گیا' کرم داد کو دھکا دے کر۔ جاندار بندہ تھا۔ کرم داد نے شور مچایا مگر اس نے قابو کرلیا اور ناک پر کلوروفارم والا رومال رکھ دیا پھر دوسرے بندے کی مدد سے گاڑی کی ڈکی میں ڈالا اور میرے پاس پہنچادیا۔"

"دیکھا نہیں کسی نے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ کام کرنے والے سیانے بندے تھے۔ آگے پیچھے دیکھ کے ہی کام کیا ہوگا۔ ایک آٹھ سال سے ہے میرے ساتھ۔ ڈرائیور ہے میرا.... دوسرا اس کا بھائی تھا۔ مکینک کا کام کرتا ہے۔ زیادہ وقت گاؤں میں رہتا ہے۔ وہاں چار گاڑیاں ہیں اور ٹریکٹر ہیں۔ ٹیوب ویل کی موٹریں بھی ٹھیک کرلیتا ہے۔ یہاں گاڑی میں کام ہو تو شہر پہنچ جاتا ہے فٹافٹ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس ہیرو کو زیرو کردو۔ آج کے بعد مجھے اپنی شکل کا بندہ اس جہان میں دوسرا نظر نہ آئے۔ مستری بڑا مخولیا ہے۔ کہنے لگا عالی جاہ' ایک تو نظر آئے گا۔ میں نے کہا کہ بکواس کرتا ہے میرے سامنے۔ وہ حرامی اڑا رہا اپنی بات پر کہ ایسا تو ہوگا۔ میں نے کہا کہ ایسا ہوگا تو پھر تو نہیں ہوگا۔ ذات کا میراثی ہے نا۔ رونے دھونے لگا کہ چوہدری صاحب' پھر تو آپ داڑھی مونچھیں رکھ لو۔ ٹنڈ کرالو۔ میں نے دو چھتر لگائے تو ہاتھ جوڑ کے بولا کہ سرکار' شیو کرنے اور بال بنانے کے لیے آئینہ دیکھو گے تو اپنے جیسا دوسرا نظر آئے گا یا نہیں؟"

گلناز لطیفے پر ہنسی "ان دونوں نے کرم داد کو ٹھکانے لگادیا؟"

"ہاں۔ رانا شوکت نے بڑا شور کیا۔ کوئی اتنا بڑا ہیرو نہیں بن گیا تھا کرم داد مگر رانا کے ساتھ کچھ فلمی دنیا کے لوگ بھی بیان بازی کرنے لگے کہ سیفو کو اس کے دشمنوں نے اسٹوڈیو کے اندر سے اغوا کرلیا اور پولیس کچھ نہیں کررہی ہے۔ پولیس نے بھی دباؤ میں بڑی دوڑ دھوپ کی۔ رانا کی مدعیت میں پرچا بھی کاٹا گیا مگر نامعلوم اغوا کنندگان کے خلاف۔ معلوم سب ہوگا اسے کہ یہ کام کس کا ہے اور اب کرم داد کے اس دنیا میں ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ مہینے دو مہینے میں سب ختم ہوگیا۔ رانا بھی فلم کو بھول گیا۔ جتنی بنی تھی اتنی ہی ڈبوں میں بند پڑی ہوگی کہیں۔"

گلناز نے فلم کی ایک ریل کا سراغ بھی لگالیا تھا اور اس کام میں اس کی مدد اسٹوڈیو والوں نے کی تھی۔ پرانے گودام کھنگالنے سے فلم کی ایک مکمل اور دوسری نامکمل ریل مل گئی تھی۔ دوسری ریل میں سیدپور میں ہونے والی ساری شوٹنگ تھی۔ اس میں سیفو بھی تھا۔ اس نے ولن کا رول بہت اچھا کیا تھا۔ اس کے ڈائیلاگ کی ڈبنگ نہیں ہوئی تھی مگر ادھوری فلم سے ساری سچویشن سمجھ میں آجاتی تھی۔ ان دو ریلوں کو ایڈٹ کرنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی چنانچہ اس کے ٹریک میں ساری فالتو آوازیں بھی بھری ہوئی تھیں اور ان میں کرم داد کی آواز بھی شامل تھی۔ ہدایت کار نے اسے کئی بار سیفو کے بجائے کرم داد کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ اس سے پہلے والے مناظر میں کرم داد کی جگہ خود چوہدری سیف الدین تھا اور غور سے دیکھنے پر اصل اور نقل کا فرق نظر آتا تھا۔ ہدایت کار اسے کبھی چوہدری سیف الدین صاحب اور کبھی سیفو کہتا تھا۔ کٹ کی آواز تو بار بار آتی تھی مگر ہدایت کار اور چوہدری سیف الدین کے کچھ مکالمے بھی ریکارڈ ہوگئے تھے۔ ان سے اندازہ ضرور ہوجاتا تھا کہ چوہدری سیف الدین کو اداکاری کا محض شوق تھا۔ وہ اپنے کام کے بارے میں سیریس نہیں تھا اور شوٹنگ میں بھی وہ اپنی چوہدراہٹ قائم رکھتا تھا۔ اس سے فلم ساز اور ہدایت کار سب پریشان تھے۔

گلناز کے پاس تمام حالات اور واقعات کے چشم دید گواہوں کی کوئی کمی نہ تھی جو یہ جانتے تھے کہ چوہدری سیف الدین کی جگہ سیدپور کے کرم داد کو کیوں لایا گیا تھا۔ اس سے سیف کتنا مشتعل ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فلم کی کاسٹ سے کرم داد کو نکلواتا یا ہدایت کار کو ہٹواتا وہ فلم رانا صاحب نے خریدلی تھی۔ اس کے اسباب جاننے والے یہ بھی جانتے تھے کہ رانا صاحب نے ایسا کیوں کیا تھا۔ ان کی چوہدری سیف الدین سے خاندانی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔

اب وقت آگیا تھا کہ چوہدری سیف الدین کے لیے پھیلائے جانے والے جال کی ڈوریاں کھینچ لی جائیں۔ گلناز نے اپنے سہاگ اجاڑنے والے سے حساب بے باق کرنے کے لیے بہت انتظار کیا تھا۔ بہت محنت کی تھی اور بہت قربانیاں دی تھیں۔ وہ کوئی عام عورت نہیں تھی جس کی فریاد پر انصاف کے کان بہرے ہوجاتے۔

نیچے سے اوپر تک ہر ادنیٰ و اعلیٰ پولیس افسر کو براہِ راست اوپر ...... سے احکامات جاری کرا سکتی تھی۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ "دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے" والے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے سارے معاملات رانا شوکت علی کے سپرد کر سکتی تھی۔ عدلِ جہانگیری کے لیے مظلوم کو محل کا گھنٹا بجانا کافی تھا۔ وہ اپنے رانا صاحب کے محل کی کال بیل دبا کے ان کے سامنے حاضر ہو سکتی تھی اور اپنی خوب صورت آنکھوں سے موتی جیسے آنسو لٹاتے ہوئے کہہ سکتی تھی کہ رانا صاحب' آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آئی ہوں میں۔ بڑی دیر سے مجھے پتا چلا ہے کہ میرے شوہر کرم داد کا قاتل چوہدری سیف الدین تھا۔

رانا صاحب گلناز جیسی ساحرہ کی حسین آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ سکتے تھے۔ یہ تو تقدیر کی کرشمہ سازی تھی کہ انہیں ایک تیر سے دو شکار کرنے کا موقع مل رہا تھا اور شکار بھی عام شکار نہیں' ایک ان کا روایتی حریف چوہدری سیف تھا جس کی گردن میں پھانسی کا پھندا فٹ ہو رہا تھا اور وہ جس گلناز کے عشق کی بازی جیتنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار تھا' وہ سیف کو خود تختہ دار تک پہنچا کے رانا صاحب کی خواب گاہ میں پہنچ گئی تھی۔ پاگل نہ ہو تو۔ مت ماری گئی اس کی بھی ایک عورت کے لیے۔ ایسی عورت کے لیے جو نام سے تو خیر سپر اسٹار ہے اور بلاشبہ حسن و شباب میں بھی قیامت ہے لیکن ہے تو ایکٹریس۔ ذرا مہنگی قسم کی چیز مگر جنس بازار۔

O☆O

وہ غسل کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہیر ڈرائر سے اپنے بال خشک کر رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہلکی سی سنہری رنگت والے ریشمی بال اڑنے لگے تھے اور ان کی خوشبو ائیر کنڈیشنر کی ٹھنڈک میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔

رانا صاحب اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے تو اس نے شوخ شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ کے دیکھا "اب کیا ہے جی!"

رانا صاحب نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے "ابھی تو کچھ نہیں۔ وہ اپنے وکیل صاحب آئے ہیں' ان سے مل لو۔"

"میں آتی ہوں تیار ہو کے۔ ایسے تو نہیں آسکتی۔"

رانا ہنسا "ایسے آجاؤ گی تو اس بے چارے پر بجلی گر جائے گی۔ بڈھا بندہ ہے مگر دل تو جوان ہے۔ مر جائے گا ہارٹ اٹیک سے۔ کچھ نہ ہوا تو دماغ ضرور خراب ہو جائے گا بے چارے کا۔ عقل خبط ہو جائے گی۔"

"چلیں اب زیادہ نہ بنائیں مجھے۔ میں آتی ہوں کپڑے پہن کے۔" گلناز نے رانا کو باہر دھکیل دیا۔

وکیل رانا شوکت علی کے تمام قانونی اور غیر قانونی مسائل برسوں سے حل کر رہا تھا اور کوئی معمولی وکیل نہیں تھا۔

"میں نے اس مسئلہ پر ہر پہلو سے غور کیا ہے میڈم!" وہ بولا

"سب سے پہلے تو آپ ایک ایف آئی آر درج کرائیں' سیف کے خلاف۔ اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں۔"

"وہ سب ہوگیا ہے۔ ایس ایچ او آیا تھا صبح" رانا صاحب نے کہا۔

"آپ کے پاس کیا ہے کرم داد کو اپنا شوہر ثابت کرنے کے لیے۔ نکاح نامے کی اصل؟"

"جی نہیں۔ نکاح نامہ تو نہیں ہے مگر گواہ بہت ہیں" گلناز نے کہا "سید پور آنے والے یونٹ کے ارکان یہ بات جانتے ہیں۔"

"ویری گڈ!"

"مجھے یہ بتائیں وکیل صاحب کہ میں کیسٹ پیش کروں گی تو کیا عدالت پوچھے گی نہیں کہ آپ نے یہ سب گفتگو کیوں ریکارڈ کی تھی؟"

"کہنے کو آپ کہہ سکتی ہیں کہ مجھے سیف پر شک تھا۔ کسی نے مجھے گمنام فون کرکے یہ بتایا تھا مگر آپ یہ سب چھوڑ دیں۔ خوا مخواہ لمبی جرح کے چکر میں پڑ جائیں گی آپ۔"

"تم تو یہی کہو کہ مجھے نہیں معلوم' میرے اور سیف کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو کس نے ریکارڈ کی۔ ظاہر ہے کوئی اندر کا آدمی تھا۔ شک جائے گا ملازموں پر۔ تم کہہ سکتی ہو کہ تمہاری ایک سیکریٹری تھی جو اچانک ملازمت چھوڑ گئی ہے" رانا نے کہا۔

"بالکل صحیح فرمایا رانا صاحب نے۔ یہ فرض کرلیا جائے گا کہ وہ کوئی سیف کے ہاتھوں زک اٹھانے والی لڑکی تھی جس نے یہ انتقامی کارروائی کی۔ آپ کہیں کہ وہ چند ماہ قبل آئی تھی۔ آپ نے ترس کھاکے اسے رکھ لیا۔ اسے ملازمت کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے کام بھی ٹھیک کیا۔ وہ شریف اور ایماندار تھی۔ جاتے وقت کچھ نہیں لے گئی۔ یہ معلوم نہیں کہ اس نے اپنا نام پتا ٹھیک بتایا تھا یا غلط بیانی کی تھی۔ اس کے اچانک چلے جانے کے چند دن بعد آپ کو ڈاک سے یہ کیسٹ ملے۔ فلم کی ریل آپ کے پاس پہلے سے تھی۔ آپ نے اسٹوڈیو سے حاصل کی تھی۔ اس میں آپ کے مرحوم شوہر کی اداکاری تھی۔ آپ نے یادگار سمجھ کے رکھ لی تھی۔"

وکیل بہت دیر اسے قانونی لائحہ عمل کے نکات سمجھاتا رہا اور یہ بتاتا رہا کہ عدالت میں اسے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے۔ مخالف وکیل اس سے کیا پوچھ سکتا ہے۔ کس بات کا اثر مقدمے پر غلط پڑسکتا ہے۔ جرح میں اس کے جوابات کیا ہوں گے۔ گواہ کون ہوں گے اور کیا کہیں گے۔ ان تمام معاملات کو سنبھالنا وکیلوں کا کام ہے۔ ممکن ہے چوہدری سیف اپنے اثر رسوخ کے باعث ماتحت عدالت میں موت کی سزا سے بچ جائے لیکن اپیل میں عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ سے اسے موت کی سزا ہونی یقینی ہے۔

اس کے جانے کے بعد گلناز کو خوف نے گھیرلیا۔ "رانا صاحب۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ چوہدری سیف کا خاندان مجھے چھوڑے گا نہیں۔"

رانا نے اسے تسلی دی "تم اب رانا شوکت علی کے گھر میں ہو۔ اس کی مہمان ہو۔"

"صرف مہمان؟"

وہ ہنس پڑا "نہیں۔ بلائے جان بھی ہو۔ اگر تم مجھ سے شادی کرلو تو پھر کوئی تمہاری طرف نظر اٹھاکے نہیں دیکھ سکتا۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے شادی کرلی ہے۔"

"شادی کیئے بغیر ہی؟"

اس نے نظر جھکالی "بس نکاح ہی تو نہیں ہوا ہے۔"

رانا نے اسے غور سے دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شادی کا اعلان ہی کافی ہو تو نکاح کے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک شرعی اور قانونی زنجیر اپنے پیروں میں ڈالنا کون سی عقلمندی ہے۔ جب وہ محسوس کریں کہ اب انہیں ایک دوسرے کی ضرورت نہیں رہی تو وہ شکر گزاری کے دوستانہ جذبات رکھتے ہوئے آسانی سے علیحدہ بھی ہوسکتے ہیں۔ نکاح کی طرح طلاق کا اعلان اور بات ختم۔

○☆○

وہ چوہدری سیف الدین کی زندگی کی آخری رات تھی جو اپنے آخری چند گھنٹوں کی مسافت طے کررہی تھی۔ سیکنڈ اور منٹ گزرتے جارہے تھے۔ یوں جیسے طوفانی رفتار سے دوڑنے والی ایکسپریس ٹرین کی راہ میں آنے والے گاؤں دیہات کے اسٹیشن۔ سائن بورڈ' بجلی کے کھمبے اور درخت سب مخالف سمت میں بھاگتے ہوئے غائب ہوتے جاتے ہیں۔

اس کی آخری ملاقات بھی ختم ہوچکی تھی۔ ان کی خاندانی دولت اور ان کا اثر رسوخ آخری وقت میں بس اتنا ہی کام آیا تھا کہ یہ ملاقات تین گھنٹے جاری رہی تھی۔ چوہدری سیف الدین کا باپ' بڑا چوہدری' اس کا تایا۔ اس کے چاچے جن کے سر پر غرور پر طرہ دستار کو کسی نے خم ہوتے نہ دیکھا تھا۔ عام بے بس لاچار اور لاوارث لوگوں کی طرح صرف آنسو بہاتے رہے تھے۔ وہ پانی کی طرح پیسہ بہاکے دیکھ چکے تھے۔ بڑے بڑے ناموں والے فوجداری مقدمات کی پیروی کے ماہر وکیلوں کا ایک پینل بھی چوہدری سیف الدین کے گلے میں پڑا ہوا پھانسی کا وہ پھندا نہیں نکال سکا تھا جو سید پور کے ایک کمہار کی بیوی' فلموں میں اداکاری کرنے والی' دو ٹکے کی بازاری عورت کی شکایت پر سیشن کورٹ کے فیصلے نے ڈال دیا تھا۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ رائیگاں گئی تھی۔ ان کی کوئی سفارش کام نہیں آئی تھی اور ہر اپیل مسترد ہوتی چلی گئی تھی۔ بالآخر صدر نے رحم کی اپیل بھی مسترد کردی تھی اور بلیک وارنٹ موصول ہونے کے بعد آخری صورت یہ رہ گئی تھی کہ اس عورت کو خون بہا لینے پر راضی کرلیا جائے۔

لیکن وہ عورت جو پہلے رانا شوکت علی کی پناہ میں قلعہ بند ہو کے بیٹھ گئی تھی اب نہ جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ اس نے فلمی دنیا کو بہت پہلے خیرباد کہہ دیا تھا اور مشہور یہی تھا کہ اس نے رانا سے نکاح کرلیا ہے۔ وہ جب باہر نکلتی تھی تو اس کے ساتھ آگے پیچھے مسلح گارڈ رہتے تھے۔ ابتدائی مرحلے میں کسی اس سے رابطے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ چوہدریوں کو اپنی اور اپنی دولت کی طاقت پر ناز تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ چوہدری سیف الدین کو باعزت رہائی کے بعد ہار پہنا کے جلوس کی صورت میں واپس لائیں گے مگر اب وہ وقت آگیا تھا کہ انہیں اس کی میت پر پھول ڈال کے اسے واپس گھر لانا تھا۔ یہ سب ان کے لیے ناقابلِ تصور تھا۔

اس عورت نے اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے مقدمے پر اپنی گرفت قائم رکھی تھی۔ اس کی ساری طاقت تھی وہ حسن وشباب جس نے اسے سید پور سے اٹھا کے لاہور پہنچا دیا تھا اور صفِ اوّل کی ہیروئن بنا دیا تھا۔ رانا شوکت علی نے صرف موقع سے فائدہ اٹھایا تھا اور اس عورت کی حفاظت کی ذمے داری قبول کرلی تھی۔ اس نے خود بڑے چوہدری کو پیغام بھجوادیا تھا کہ میرا اس مقدمے سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں اور نہ میری خواہش ہے کہ چوہدری سیف کا انجام تختۂ دار پر ہو لیکن گلناز میری بیوی ہے۔ اس پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔ کسی نے اسے کمزور یا لاوارث سمجھا تو پھر مجھے مقابلے پر آنا پڑے گا۔

اس وقت جب قانونی طور پر سیف کی زندگی بچانے کی ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں، گلناز کی رانا شوکت علی سے طلاق کی خبریں شائع ہوئیں اور وہ معلوم نہیں کہاں چلی گئی۔ صورت حالات کو مستقبل کے آئینے میں دیکھنے والوں نے بہت..... پہلے سے اشارے دینے شروع کردیے تھے کہ اس عورت کو راضی کرلو۔ اگر وہ معاف کردے تو قصاص اور دیت کے قانون کے تحت سیف کی جان بچ جائے گی۔ جب بالآخر چوہدریوں نے محسوس کیا کہ ان کی خاندانی پگ ایک کمین کی بیٹی کے قدموں میں ڈالے بغیر ملک الموت کو ٹالا نہیں جاسکے گا تو انہوں نے اپنی شکست کی اس ذلت کو بھی قبول کرلیا۔ خود سیف نے اس کی مخالفت کی۔ وہ خاندانی وقار کا جنازہ نکالنے اور اپنے ذی شرف آباواجداد کی باعثِ فخر تاریخ کے سنہرے اوراق میں رسوائی کے اس سیاہ باب کا اضافہ کرنے سے عزت کے ساتھ پھانسی چڑھ جانا بہتر سمجھتا تھا مگر اس کا باپ آخر میں صرف ایک باپ رہ گیا تھا۔ جیسے کسی چمار کا یا قلی کا یا کلرک کا باپ ہوتا ہے۔

چوہدری رب نواز سینٹرل جیل سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد کے پرہیبت اور عبرتوں بھری آوازوں سے معمور سناٹے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی پگڑی کھل گئی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے اور اس کی ضعیف آنکھوں سے آنسو خود بخود نکلتے جارہے تھے۔ اس کی نظریں اپنے سامنے کھلے ہوئے قرآن میں سورہ یٰسین پر تھیں مگر اس کا تصور کہیں اور تھا۔ اس کال کوٹھری میں جہاں اس کا جوان بیٹا پھانسی گھاٹ کی طرف روانگی کے لیے تیار تھا۔

چوہدری رب نواز کے ساتھ اس کے بھائی تھے اور اس کے جواں مرد گبرو بیٹے تھے۔ اس کے بھتیجے تھے جو اس کے جنوائی بھی تھے۔ گاؤں کے معززین، دوست احباب، حلقہ شناسائی میں شامل طبقۂ خواص کے ہمدرد۔ وکیل اور وہ سب جو انہیں جھوٹ کے سہارے فراہم کرتے رہے تھے۔ رخصت کردیے گئے تھے۔

چوہدری رب نواز حویلی کا تصور بھی کرسکتا تھا۔ وہاں عورتیں بین کررہی ہوں گی، سر پیٹ رہی ہوں گی اور سینہ کوٹ رہی ہوں گی۔ سیف کی ماں اور اس کی بہنیں۔ سارا گاؤں حویلی پر سایہ فگن موت کے آسیب سے سہما ہوا جاگ رہا ہوگا۔

اچانک ایک جیپ باہر آ کے رکی۔ سادہ کپڑوں میں ایک اعلیٰ پولیس افسر کود کے اترا اور تیزی سے اندر گیا۔ سر جھکا کے تلاوت کرنے اور آنسو بہانے والوں نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

”چوہدری صاحب۔ جلدی آئیں، وہ عورت مل گئی ہے۔“

چوہدری رب نواز کے جسم میں چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ دوڑ گیا ”کہاں، کہاں ہے وہ۔ مجھے لے چلو اس کے پاس۔“

پولیس آفیسر نے کہا ”وہ خود ملنا چاہتی ہے آپ سے۔ وہ اس وقت آپ کے گاؤں میں موجود ہے۔ آپ کی حویلی کے پاس ہی

ہے۔"

فرعونیت کے غرور کو خاک میں ملانے والے عبرت آموز لمحوں کی خاموشی کا ایک وقفہ زمینوں سے آسمانوں تک پھیل گیا اور اس کی پر تضحیک، رسوا کن اور عذاب ناک ہنسی کی بازگشت جیسے تھپڑوں کی، پھٹے جوتوں کی اور گندی گالیوں کی بارش بن گئی جو ان پر غلام زادے، کمین، ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے ننگے بھوکے بے عزت لوگ برسا رہے تھے۔ ان کی حویلیوں پر، ان کے اونچے شملوں پر۔ ان کے مغرور خاندانی چہروں پر۔

"کس سوچ میں پڑ گئے چوہدری صاحب!" پولیس افسر نے کہا "ہمیں دو گھنٹے لگیں گے جانے میں، دو گھنٹے واپس آنے میں۔ وقت ضائع مت کریں۔"

چوہدری رب نواز نے اپنی پگڑی سر پر رکھی اور اس کے شملے سے آنسو پونچھ کے کہا "چلو... میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

ایک کے بعد ایک... شاندار چمکتی دمکتی بیش قیمت لینڈ کروزر اور پجیرو اور ہنڈا اکارڈ اس راستے پر دوڑنے لگی جو امید کا راستہ تھا۔ ان کے طاقت ور سرسراتے غراتے انجن اور اندھیرے میں کالے فیتے کی طرح بچھی ہوئی سڑک پر دوڑتے پہیے زندگی کے لیے لپک رہے تھے۔ نسلوں کے غرور کی روندی ہوئی، کچلی ہوئی اور پہچانی نہ جانے والی لاش گزرنے والی گاڑیوں کے نیچے ٹوٹ کے اور بکھر کے ختم ہوتی جا رہی تھی۔

اور آواز غیب جسے کان نہیں سنتے، گونج رہی تھی۔۔۔

ہر اک اُولو الأمر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دارورسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے
سزا جزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ یومِ حساب ہوگا

گاڑیوں کا قافلہ گاؤں کی مسجد کے سامنے پہنچ کے رک گیا۔ وہاں ہر شخص جاگ رہا تھا۔ حویلی کے دیوار و در ایک المناک پر التجا خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ فضا سانس روکے سکوت میں تھی۔

گلناز صحن میں تھی پھر کسی نے مسجد کے دروازے کے باہر اس کے لیے ایک کرسی رکھ دی۔ وہ کسی ملکہ جیسی شان اور تمکنت کے ساتھ آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خطرناک اسلحے سے لیس محافظ کچھ فاصلے پر براہِ راست آنے والی گاڑیوں کو زد میں لیے کھڑے تھے اور کچھ فاصلے پر موجود ایک شاہانہ گاڑی کی کھڑکی سے جھانکنے والا سات سال کا بچہ اس ساری کارروائی کو بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ مجسٹریٹ اور وکیل نے آگے بڑھ کے چوہدری رب نواز کا استقبال کیا۔ "گلناز معافی نامے پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہے چوہدری صاحب!"

"کیا شرط ہے اس کی؟" چوہدری نے شکست خوردہ لہجے کہا۔

"آپ خود اس سے پوچھ لیں۔ باقی سب لوگ" مجسٹریٹ نے کہا۔

چوہدری رب نواز یوں آگے بڑھا جیسے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ گلناز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بولو۔ کیا چاہیے تمہیں میرے بیٹے کی زندگی کے بدلے۔"

گلناز نے اسے نظر جما کے دیکھا "تم کیا دے سکتے ہو؟"

"میں..... سب کچھ....."

"اچھا..... تو اپنی یہ پگڑی اپنے ہاتھوں سے اتار کے میرے قدموں میں رکھ دو چوہدری رب نواز!" گلناز نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

چوہدری رب نواز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ ریوالور کی طرف بڑھا پھر اس کی نظروں میں ایک لاش جھولنے لگی۔ پھانسی گھاٹ کے اندھے کنوئیں کی گہرائی میں ایک شیر خوار بچہ رونے لگا۔ سیف کے رونے کی آواز پر وہ رات کو کیسے تڑپ کے اٹھ بیٹھتا تھا۔

اس نے تڑپ کے اپنا ہاتھ سر کی طرف بڑھایا۔ اپنی پگڑی اتار کے وہ نیچے جھکا پھر اس نے صدیوں کے غرور کو ایک کمی بیوی، ایک دو ٹکے کی عورت کے قدموں میں ڈال دیا۔ اسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس ہتھیار ڈالنے کی تقریب کی کوریج کے لیے تماشائی کتنے [illegible] اور صحافی کتنے؟

گلناز نے کھڑے ہو کے کہا "وکیل صاحب۔ کہاں دستخط کرنے ہوں گے مجھے؟"

مجسٹریٹ کے ساتھ وکیل آگے بڑھا اور اس نے معافی نامے کی دستاویزات گلناز کے سامنے رکھ دیں۔ گلناز نے ہاتھ بڑھایا۔ ایک اعلیٰ پولیس افسر نے اُس کے ہاتھ میں قلم تھما دیا۔

کسی سے کوئی بات کیے بغیر وہ آگے بڑھی۔ اس کے محافظ خود بخود ساتھ ہو لیے۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے بچے نے کہا "امی۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اپنے گھر یا واپس شہر؟"

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی کاکے۔" گلناز نے کہا۔ گاڑی کے شیشوں سے اندھیرے اور خلا میں اپنے بے وجود اور غیر یقینی مستقبل کی تلاش میں اس کی نظریں بھٹکتی رہیں۔